ماہنامہ

حیات نو

ANJUMAN TALBA - E - QADEEM

BILARIA GANJ, AZAMGARH (U.P.)

ماہنامہ

حیات نو

مجلس ادارت

شفیق حاتم فلاحی	رانچی
شبیر احمد فلاحی	دہلی
نسیم احمد غازی فلاحی	دہلی
عبد الحی فلاحی	دہلی
اظہر ریحان (ب) فلاحی	سعودی عرب
عبید اللہ فہد فلاحی	علی گڑھ
اشتیاق دانش فلاحی	علی گڑھ

مدیر مسئول — نور محمد فلاحی

مدیر معاون — سید راشد علی حامدی

شعبان و رمضان ۱۴۰۳ھ مطابق مئی، جون ۱۹۸۳ء

شمارہ نمبر ۲، ۳ — جلد ۵

سالانہ زر تعاون ۲۰/ روپے

اس شمارہ کی قیمت ۳/ روپے

نقوش حیات نو

وضاحتیں	سادگی مسلم کی دیکھو...	سید راشد علی حامدی فلاحی
بارگاہ نبوی سے	نیت اور عمل	مولانا اقبال احمد صاحب قاسمی
فکر و خیال	روزہ ایک ضرورت	محمد فاروق خاں
	جماعت اسلامی کیوں بنی؟	حافظ جمال احمد
	شادی تاریخ - ایک اسلامی پہلو	مولانا مقبول احمد ندوی
	وہ نادر مست کر	فضل رب اصلاحی
	اقبال اور فلسفۂ تعلیم	جسٹس سید غوث علی
	ادب، اسلام اور خواتین	ام فاروق لاہور
	مساوات کی آبیاری	سلطان احمد اصلاحی
	اقبال اور نژاد نو	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
عالم اسلام	مجاہدین افغان کامیابی کی راہ پر	اظہر ریحان فلاحی
معلومات	نوح کی کشتی	مولانا ظفر احمد خضری (الفلاح)
شعر و سخن	غزل	عزیز بگھروی
یہ میرا چمن ہے	جامعہ کے لیل و نہار	حسن حبیب الدین احمد

مطبوعہ: نشاط پریس، ٹانڈہ فیض آباد

دھڑکنیں

سیاہی کی مسلم کشی دیکھ اور یہود کی عیاری بھی دیکھ

آسام میں غیر ملکیوں کے مسئلے پر جو کچھ ہوا ہندوستان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی اس کی مذمت کی گئی اور اس کو ایک غیر انسانی فعل قرار دیا گیا۔ ملک کے تمام ہی اخبارات و رسائل میں اس بہیمیت و خونریزی کی اور قتل و غارت گری پر مضامین شائع ہوئے اس کے خلاف اداریے لکھے گئے۔ یہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان سے مظلوموں کی امداد کے لئے فنڈ اکٹھا کیا گیا۔ ان کی از سر نو آبادکاری کیلئے کوششیں ہوئیں اور ہو رہی ہیں مگر اس کو کیا کہا جائے کہ ہمارے اندر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اوپر سے مظلوموں کی حمایت کر رہے تھے، ان کے لئے چندے کی اپیلیں کر رہے تھے لیکن موقع پاتے ہی یہی لوگ ملت کے سینے میں خنجر اتارنے سے نہیں چوکے اور درد ملت جو غیروں کے لگائے ہوئے زخموں سے تڑپ اور سسک رہی تھی اب اپنوں کو زخم سے مرغ بسمل بنی ہوئی ہے۔

حال ہی میں عراق میں "اسلامی کانفرنس" کے نام سے جو کانفرنس ہوئی اس میں ہندوستان کے ایک "دیندار" اور "صاحب زہد و تقویٰ" بزرگ نے اس بات کی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تردید کی کہ آسام میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ ہندوستان سے باہر تو اس سے ہندوستان کی "جمہوریت نوازی" کو برقرار رکھا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان میں یہ دھول کسی کی آنکھوں میں نہیں جھونکی جا سکتی۔

میں نے اس سے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ جب کسی قوم کے اندر اجتماعیت پر انفرادیت کو ترجیح دینے کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں اور ذاتی و انفرادی مفادات پر اجتماعی مفادات کو قربان کرنے کا مرض پیدا ہو جاتا ہے تو وہ قوم عروج و ارتقاء کی بلندیوں سے تنزل و انحطاط کی پستیوں میں پھینک دی جاتی ہے اور وہ اس وقت صرف اپنے وجود و بقا کے لئے جنگ لڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹ جاتی ہے کہ تاریخ کے صفحات میں بھی بمشکل جگہ پاتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دہلی میں اکالیوں پر لاٹھی چارج کے مسئلے پر اکالیوں کے تمام ممبران پارلیمنٹ نے اپنے استعفے پیش کر دئے تھے لیکن اس ملت کے رہنماؤں کی بے حسی اور بے غیرتی کو کیا نام دیا جائے کہ ملت کو نیست و نابود کرنے اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے اکثریتی فرقہ منصوبہ بند سازشیں کرتا ہے تو مسلم ممبران پارلیمنٹ کے استعفے تو دور کنار خود اس مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا یہ فساد فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا یا غیر فرقہ وارانہ۔ گویا کہ وہ بزعم خود [illegible] لا تعتدوا کے قرآنی حکم پر عمل کر رہے ہیں اور عدل و انصاف کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے۔

میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آسکی کہ اکثریتی فرقہ اگر ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا ہے تو کون سی بڑی بات ہے۔ ان نام نہاد بزرگوں نے بھی تو ہمیشہ ملت کا سینہ زخمی کیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غیروں کے غم تو برداشت ہو جاتے ہیں لیکن اپنوں کے غم ناقابل برداشت ہوتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

ایک طرف آسام کا مسلم کشی کا یہ حال ہے تو دوسری طرف مسلم ممالک میں افتراق و انتشار کے خدشات بڑھتے جا رہے ہیں۔ [illegible]

بارگاہِ نبوی سے

نیت اور عمل

مولانا اقبال احمد قاسمی
استاد جامعۃ الفلاح

عن عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول انما الاعمال بالنیات وانما لامرء ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی اللّٰہ ورسولہ فھجرتہ الی اللّٰہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ ۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "اعمال کا دار ومدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت کے مطابق ہی اجر ملے گا۔ تو جس شخص نے اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کی طلب میں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی کے جذبے کے تحت ہجرت کی ہوگی ــــ اس کی ہجرت واقعی اور صحیح معنی میں خدا اور رسول کی طرف ہجرت ہوگی، یقیناً وہ اللہ اور رسول کا سچا مہاجر ہوگا اور قیامت کے روز اس کو اس ہجرت کا بہترین اجر و ثواب ملے گا۔ اور جس نے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر ہجرت کی ہوگی ــــ اس کی ہجرت دنیا یا عورت ہی کے لئے ہوگی، خدا اور رسول کی طرف نہیں ہوگی اور آخرت میں وہ اس ہجرت کے لئے کسی اجر و ثواب کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔" (بخاری و مسلم)

یہ حدیث ذخیرۂ احادیث کی اہم ترین حدیثوں میں شمار کی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے متواتر ہونے تک دعویٰ کیا ہے۔ اگرچہ اس کا تواتر لفظی مختلف فیہ ہے مگر اس کے تواتر معنوی ہونے پر تقریباً اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں دو مختلف حوالوں سے ایسے اکتیس ۳۱ صحابہؓ و صحابیاتؓ کا نام بنام ذکر کیا ہے جن سے اس مفہوم کی متعدد احادیث مختلف کتب حدیث میں مروی ہیں۔ مثلاً

یُبْعَثُوْنَ عَلٰی نِیَّاتِہِمْ (مسلم عن ام سلمۃ رضی اللہ عنہا)

لٰکِنْ جِہَادٌ وَّ نِیَّۃٌ (بخاری، مسلم عن ابن عباسؓ)

مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ہِیَ الْعُلْیَا فَہُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (بخاری، مسلم عن ابی موسیٰ اشعریؓ) رُبَّ قَتِیْلٍ بَیْنَ الصَّفَّیْنِ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِنِیَّتِہٖ۔ (مسند احمد عن عبد اللہ بن مسعودؓ) مَنْ غَزَا وَھُوَ لَا یَنْوِیْ اِلَّا عِقَالًا فَلَہٗ مَا نَوٰی

(النسائی عن عبادة بن صامت) فتح الباری ج ۱ ص ۱۲

● پس منظر اس حدیث کا یہ ہے کہ مکہ کے ایک شخص نے ام قیس نامی ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ اس نے جواب دیا کہ اگر تم ہجرت کر کے یہاں مدینہ آ جاؤ تو میں تمہارے ساتھ نکاح کرنے پر آمادہ ہوں۔ چنانچہ وہ شخص اسی نکاح کی غرض سے مکے سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا نام قیلہ تھا مگر وہ عام طور سے مہاجر ام قیس کے نام سے مشہور تھا اور تمام لوگ اس کو اسی نام سے جانتے تھے۔ اگرچہ محدثین نے عہد رسالت کے اس شخص خاص کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرایا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے ایک خاص موقع پر یہ بات فرمائی تھی مگر اس کا یہ حکم عام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ خاص شخص تو پردۂ خفا میں چلا گیا جس کے متعلق یہ بات کہی گئی تھی البتہ یہ حدیث ہر اس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔ حدیث کا [مقصد] مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ اعمال کی مقبولیت و مردودیت کا حقیقی معیار و مدار نیتیں ہیں۔ خدائے قدوس کی بارگاہ میں صرف وہی اعمال "صالح" اور لائق اجر شمار ہوں گے جو اخلاص نیت کے ساتھ خالصۃً لوجہ اللہ کئے گئے ہوں۔ جو اعمال کسی دنیاوی غرض کے تحت فاسد نیت کے ساتھ کئے گئے ہوں گے وہ نہ تو خدا کے دربار میں "صالح" ہوں گے نہ قابل قبول و لائق اجر و ثواب قرار پائیں گے خواہ وہ بظاہر کتنے ہی صالح اور عظیم نظر آتے ہوں۔

● خدائے تعالیٰ عمل کے ساتھ دل کو اور اعضاء و جوارح کے ظاہری اعمال و حرکات کے ساتھ دل کے اندر پوشیدہ اور موجزن جذبات و خطرات سے بھی پوری طرح واقفیت و آگاہی رکھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں اصل قدر و منزلت اشکال و اجسام کی نہیں قلوب و نیات کی ہے۔ اس کی بارگاہ میں شرف قبولیت و باریابی اجساد و ابدان اور افعال و اعمال کو نہیں خلوص و تقویٰ اور اخلاص و للہیت کو حاصل ہوگا۔

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج ۳۷)

خدا کے حضور نہ تمہاری قربانیوں کے گوشت پہنچتے ہیں نہ خون۔ مگر اس کی بارگاہ میں تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ (مسلم عن ابی ہریرہ)

اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

خدائے علیم و خبیر کی نظریں سب سے پہلے انسان کے دل کو دیکھتی ہیں اور اس کے اندرون کو ٹٹولتی ہیں کیونکہ دل ہی اچھے برے اور پسندیدہ و ناپسندیدہ جذبات و احساسات کا سرچشمہ ہے۔ صالح اور غیر صالح اعمال و حرکات کا صدور انھیں اچھے یا برے جذبات و رجحانات کے تحت ہوتا ہے اور نیکی و بدی کے سوتے اسی سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں پھر وہ آدمی کے اعمال پر نظر ڈالتا ہے۔ دل اگر درست نہیں ہے اگر اچھے اعمال کی پشت پر اچھی نیتوں اور صالح جذبات کی تحریک موجود نہیں ہے تو بڑے سے بڑا عمل اور پہاڑ جیسا عظیم اور وزنی کارنامہ بھی خدا کی نظر میں ایک ذرۂ حقیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور خلوص و للہیت کے جذبے سے عاری بڑے سے بڑے صاحب مال و اقتدار شخص کو خدا کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں حاصل ہوگا۔

اِنَّهٗ لَيَاْتِي الرَّجُلُ الْعَظِيْمُ السَّمِيْنُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يَزِنُ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ۔ اِقْرَؤُا فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (مسلم عن ابی ہریرہ)

دل کی وابستگی اور اس کا خلوص ہی آدمی کی اصل پونجی اور اس کا حقیقی سرمایہ ہے۔ اسی کے ذریعہ سے اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی حیثیت ایک ویرانے اور کھنڈر سے زیادہ نہیں۔ دل کا خلوص ہی دراصل اس کی زندگی ہے اور دل کی زندگی انسان کی زندگی ہے دل کا خلوص سے خالی ہونا اس کی موت اور دل کی موت انسان کی موت ہے۔ ؎

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

انسان کے لطیف ترین اور بیش قیمت جذبات — عبودیت و بندگی، تقویٰ و خدا ترسی، انابت و خشیت، اطاعت و فرمانبرداری اور صبر و شکر دل ہی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہی جذبات اعمال انسانی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور خدا کے یہاں مال و اولاد کی نہیں انہیں جذبات کی قدر ہوتی ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعراء ۸۸۔۸۹)

(اس روز نجات کے لئے آدمی کا مال کام آئے گا اور اس کی اولاد کام آئے گی، ہاں اس کی نجات ہوگی جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے گا)

▪ اخلاص کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی انسان کو نجات نہ دلا سکے گا بلکہ الٹا اس کے لئے دخول جہنم کا سبب بن جائیگا۔

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

"سب سے پہلا شخص جس کے خلاف قیامت کے دن دوزخ میں ڈالے جانے کا فیصلہ خدائے تعالیٰ کی عدالت سے کیا جائے گا ایک ایسا شخص ہوگا جو جہاد میں شہید کیا گیا ہوگا۔ یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا۔ پھر خدائے تعالیٰ اس کو بتلائے گا کہ میں نے تجھے کیا کیا نعمتیں دی تھیں وہ ان تمام نعمتوں کا اقرار کرے گا پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تونے ان نعمتوں سے کیا کام لیا اور ان کو کن مقاصد میں استعمال کیا؟ وہ کہے گا خداوند عالم! میں نے تیری راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ میں شہید کر دیا گیا۔ اور اپنا سب سے بیش بہا اور قیمتی متاع — جان عزیز بھی تیری راہ میں قربان کر دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نے تو جہاد میں اس نیت سے حصہ لیا تھا کہ تیری جرأت و شجاعت اور دلیری و جواں مردی کا شہرہ ہو۔ تو تیرا مقصد حاصل ہو گیا اور دنیا میں تیری بہادری کے خوب خوب چرچے ہوئے۔ پھر اس کے لئے حکم خداوندی ہوگا۔ اور وہ منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص ہوگا جس نے علم دین حاصل کیا ہوگا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی ہوگی اور خوب قرآن پڑھا ہوگا اس کو بھی خدائے تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کرائے گا۔ وہ ان تمام نعمتوں کا اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ اور ان کو کن مقاصد کے حصول میں استعمال کیا۔ وہ کہے گا کہ پروردگار عالم! میں نے دین کا علم حاصل کیا اور اسے دوسروں کو سکھایا۔ تیری رضا و خوشنودی کے حصول کے لئے قرآن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے یہ بات بالکل غلط کہی تو نے دین کا علم اور قرآن کی تعلیم اس لئے حاصل کی تھی کہ تجھے عالم اور قاری کہا جائے چنانچہ دنیا میں تجھے خوب خوب عالم اور قاری کہا گیا اور تیرے علم و قرأت کی خوب شہرت ہوئی پھر اس کے لئے حکم خداوندی ہوگا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ایک اور تیسرا شخص تھا جس کو خدائے تعالیٰ نے دولت کی فراوانی

اور کثرت اور گونا گوں فراوانی سے نوازا ہوگا اور جسے طرح طرح کا مال دیا
ہوگا۔ وہ بھی خدا کے حضور پیش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی
اپنی نعمتیں یاد دلائے گا وہ ساری نعمتوں کا اقرار کرے گا
پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے میری عطا کردہ ان نعمتوں
سے کیا کام لیا اور انہیں کن مقاصد کے لئے استعمال کیا؟ وہ کہے
گا کوئی ایسی جس پر راستے اور جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے
پسند ہے، میں نے تیرا دیا ہوا مال ان سب ہی میں خرچ کیا
اور میں نے یہ کام صرف تیری رضا کی طلب میں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے
گا تو جھوٹ بولتا ہے۔ درحقیقت تو نے یہ سب صرف اس لئے
کیا کہ دنیا میں تیری سخاوت اور فیاضی کے چرچے ہوں اور
تیری دریا دلی اور بخشش و عطا کی شہرت دور دور تک
پہنچ جائے۔ سو تیرا یہ مقصد پورا ہو گیا، دنیا میں تیری داد
و دہش کا خوب خوب شہرہ ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عدالت سے اس
کے لئے بھی فیصلہ صادر ہوگا اور وہ بھی منہ کے بل گھسیٹ
کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔" (مسلم عن ابی ہریرہ)

یہ حدیث ہر صاحب ایمان اور باشعور و حساس مسلمان کو
لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی ہے۔ بعض روایات
میں آیا ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی
اس کو بیان کرتے وقت کبھی کبھی بے ہوش ہو جایا کرتے
تھے۔ ایک دفعہ یہ حدیث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ
کے سامنے بیان کی گئی تو وہ بہت روئے اور روتے
روتے بے حال ہو گئے۔ اس حدیث میں جن تین اعلیٰ
درجے کے اعمال کا ذکر ہے اگر واقعی وہ خلوص دل کے ساتھ
محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور خالصۃً لوجہ اللہ کئے گئے ہوتے
تو بلا شبہ ان کا صلہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی اور جنت
کے اعلیٰ درجات ہیں۔ لیکن یہی اعمال جب طلب شہرت،
جذبۂ ریاکاری اور دوسرے حقیر دنیاوی مقاصد کے حصول
کی غرض سے کئے جائیں تو خدائے تعالیٰ کے یہاں ان کا کوئی
اجر نہیں بلکہ الٹا ذلت و رسوائی کے ساتھ دخول نار کا سبب
بن جائیں گے۔ خالص دنیاداری کا کام جس کو آدمی اپنی ضرورت یا
ذمہ داری کے طور پر انجام دیتا ہے اگر ان میں نیت کا خلوص
اور اس کی پاکیزگی شامل ہو جائے تو وہ کام بھی اس کے لئے باعث
اجر و ثواب بن جائیں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے

"جو شخص اپنے بستر پر اس ارادے اور نیت سے لیٹا
کہ وہ تہجد کے لئے اٹھے گا لیکن اس کی نیند گہری ہو گئی اور وہ
اٹھ نہ سکا یہاں تک کہ فجر ہو گئی تو ایسے شخص کے نامۂ اعمال
میں اس رات کی نماز تہجد لکھی جائے گی۔ اور یہ نیند اس کے
لئے اس کے رب کی طرف سے بطور انعام شمار ہوگی (ابوداؤد، نسائی)

اخلاص سے خالی عظیم ترین اعمال ضائع و برباد ہو
جاتے ہیں لیکن خلوص کے ساتھ کیا ہوا معمولی عمل بھی آدمی
کی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل نے
فرمایا کہ جس وقت آپ ﷺ مجھے یمن بھیج رہے تھے میں نے
عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے تو آپ
نے فرمایا کہ "اپنی نیت کو خالص رکھو، جو بھی عمل کرو خدا کے لئے
کرو تو تھوڑا سا عمل بھی تمہاری نجات کے لئے کافی ہے" (بزار)

یہی نہیں بلکہ اگر آدمی خلوص نیت کے ساتھ کوئی کام
کرنا چاہتا ہو مگر اپنی مجبوریوں کے سبب اسے اس میں
شریک ہونے کا موقع نہ مل سکے تو بھی وہ اس کے ثواب
سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ حضرت انس رضی سے روایت ہے
کہ تبوک کی مہم سے فارغ ہو کر ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ
واپس ہوئے تو آپ نے راستے ہی میں فرمایا کہ:

"کچھ لوگ مدینے میں ہمارے پیچھے مقیم ہیں لیکن وہ
ثواب میں اس سفر میں ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ ہم لوگ
جس گھاٹی میں سے گزرے اور جو وادی بھی ہم نے طے کی ہر جگہ وہ

ہمارے ساتھ رہے۔ ان کو عذر نے روک دیا تھا۔

● خدائے تعالیٰ سے اجر و ثواب کی طلب کے علاوہ کسی دنیاوی غرض یا شہرت و ناموری کی خواہش میں کوئی کام کرنا ریا ہے۔ اور ریا کی ادنیٰ مقدار بھی شرک اور رب ذوالجلال کی توہین ہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں پہنچے تو وہاں دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نبی کریمؐ کے روضہ مبارک کے پاس بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ انہوں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرمؐ سے سنا تھا کہ "تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔" یہی بات مجھے رلا رہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ "جو آدمی لوگوں کے سامنے تو اچھے طریقے سے خوب خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتا ہے مگر جب تنہائی میں پڑھتا ہے تو ٹھیک سے نہیں پڑھتا۔ یہ شخص اپنے رب کو حقیر سمجھتا اور اس کی توہین کرتا ہے۔"

● قرآن پاک میں صدقہ و خیرات کرنے والے دو قسم کے آدمیوں کے انجام کو ایک مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ ایک قسم کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے ریاکاری اور طلب شہرت کی نیت سے اپنے مال خیر کے کاموں میں خرچ کئے۔ دوسرے وہ جو محض اللہ کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کی طلب میں حاجت مندوں اور فقراء و مساکین کی مدد کرتے ہیں۔ دونوں کے کام قطعی طور پر یکساں دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کے عمل میں بظاہر کوئی فرق نہیں نظر آتا۔ لیکن خداوند علیم و خبیر اور رب عظیم "نیت" کا فرق دیکھتا ہے اور یہی خبر دیتا ہے کہ چونکہ دونوں کی نیتوں میں فرق تھا اس لئے دونوں کے نتیجے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ ایک کا عمل خدا کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل کرے گا اور دوسرے کا عمل ضائع و برباد ہو جائے گا۔

"اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔ اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے دل کے پورے قرار و ثبات کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دو گنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار اس کے لئے کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آ کر جھلس جائے جب کہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں۔ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے شاید کہ تم غور و فکر کرو۔" (تفہیم القرآن، البقرہ ۲۶۴ تا ۲۶۶)

ریاکار کی ریاکاری خود اس بات کی دلیل ہے کہ نہ تو وہ خدا پر یقین رکھتا ہے جس سے اجر پانے کی توقع رکھے۔ نہ آخرت پر اس کا ایمان ہے جہاں وہ اپنے عمل کا ثواب حاصل کرنے کی امید رکھتا ہو۔ محض لوگوں کو دکھانے کے لئے اس کا عمل کرنا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ مخلوق ہی اس کی خدا ہے جس

سے وہ اجر و ثواب کا خواہش مند ہے۔ اللہ سے خواہش کرنا اجر کی توقع ہے اور خدا سے اس بات کا یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے اللہ کے رسولؐ نے ریا کاروں کو سخت ترین عذاب کی وعید سنائی ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال إنّ في جهنم لواديا تستعيذ جهنم من ذلك الوادي في كل يوم أربع مائة مرة۔ أُعِدّ ذلك الوادي للمرائين من أمة محمد صلى الله عليه وسلم لحامل كتاب الله والمتصدق في غير ذات الله والحاج إلى بيت الله وللخارج في سبيل الله۔ (زادراہ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جہنم میں ایک ایسی وادی ہے جس سے جہنم بھی ہر روز چار سو مرتبہ پناہ مانگتا ہے۔ یہ وادی محمدؐ کی امت کے ریاکاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ کتاب اللہ کے عالم کے لئے، صدقہ و خیرات کرنے والے کے لئے، بیت اللہ کا حج کرنے والے کے لئے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لئے۔

● تمام انسانوں کو خداوند عالم کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ عبودیت و بندگی کے سارے مراسم صرف اسی کے لئے ادا کریں۔ اور ان میں شرک و ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ پیدا ہونے دیں۔ وما أُمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء (البینہ ۵) اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر۔

خدا کے یہاں اجر و ثواب کا حقدار قرار پانے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا ہر کام خالصتاً لوجہ اللہ ہو اور شہرت و ناموری کی خواہش سے پاک ہو۔ ہمارے ظاہر کی طرح باطن کا قبلہ بھی بالکل درست ہو۔

اور ہم ایک مسلم حنیف کی طرح دل کی گہرائیوں سے اس بات کا اعلان کریں کہ:

إني وجهت وجهي للذي فطر السماوات والأرض حنيفا وما أنا من المشركين۔ إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين۔ لا شريك له (انعام ۷۹، ۱۶۳)

میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے۔ اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں۔ میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے
— جس کا کوئی شریک نہیں۔

لیکن یہ اعلان جتنا آسان ہے زندگی بھر ہر کام پر کاربند رہنا اور اپنے دل کو ریا کے ہر شائبہ سے پاک رکھنا اتنا سہل نہیں ہے۔ ریا ایک ایسا جذبہ ہے جو نہایت خاموشی کے ساتھ بالکل دبے پاؤں آدمی کے دل میں سرایت کرجاتا ہے اور آدمی دھوکے میں پڑا رہ جاتا ہے اور اس کا پورا خرمن عمل جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے دل کی پوری چوکسی اور دربانی کرنی پڑے گی ـــ

مرا ایسی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

* *

(بقیہ صفحہ ۴ کا)

سادگی کا یہ عالم ہے کہ ہم ان دوست نما دشمنوں کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ ہماری آستینوں میں سانپ پل رہے ہیں اور ہم بے خبر ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں جو تحریک اسلامی کے افراد پر کیچڑ اچھالنے پر اتر آتے ہیں تو ان کو کافر و زندیق اور ضال و مضل کے خطابات سے نوازتے ہیں جب کہ

ان کے ہاتھ خود ملت کے خون
سے رنگے ہوئے ہیں

روزہ ایک ضرورت

محمد فاروق خاں

انسانی فطرت اسلام نے اصلاً جس چیز کا مطالبہ انسان سے کیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اصل تقاضوں کو سمجھے اور انھیں پورا کرنے کی کوشش کرے۔ وحی کے ذریعہ اللہ نے انسان کو اس کی اپنی ہی فطرت کے تقاضے یاد دلائے ہیں۔ اللہ نے انسان کو اپنی خاص صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اسے عام مخلوقات کے مقابلے میں حریت اور عظمت عطا کی ہے۔ اسے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ مفہوم سے واقفیت حاصل کر سکے۔ یہی چیز ہے جو اسے عام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن کم لوگ ہیں جنہیں اس کا صحیح احساس ہو۔ عام طور پر ذہنوں پر مادی پہلو ہی غالب ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی سے [illegible] پاکیزگی کی [illegible] دیکھنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم لوگ زندگی کی اہم قدروں اور بیش قیمت حقیقتوں کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

روزہ کی ضرورت انسان کی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کے ابھرنے اور نشوونما پانے کے لئے تعلیم و تربیت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ روزہ جسے اللہ نے ہم پر فرض کیا ہے ایک مقدس ترین عبادت ہی نہیں بلکہ وہ ہماری تربیت کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہے۔ روزے کا اصل مقصد جیسا کہ [illegible] تقویٰ ہے (البقرہ)۔ پاکیزگی حاصل کرنے اور تقویٰ کے مقام مطلوب تک پہنچنے کے لئے روزہ ایک اہم ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ پچھلی امتوں پر بھی فرض رہا ہے۔ ضبط نفس کے بغیر انسان کے اندر تقویٰ کی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ روزہ ضبط نفس کا ایک موثر اور فطری ذریعہ ہے اس کے ذریعہ انسان کو اپنی نفسانی خواہشات پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ نفسانی خواہشات کا بندہ خدا کی عظمت سے بے خبر ہو جاتا ہے اس کی خواہشات اسے زندگی کی اعلیٰ حقیقتوں اور قدروں کی طرف سے غافل بنا دیتی ہیں۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب [illegible] پیٹ سے زیادہ مبغوض [illegible] نہیں ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسا آدمی غفلت کا شکار ہوتا ہے۔ غالب [illegible] اسے موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ اپنی فطرت کے حقیقی تقاضوں کی طرف متوجہ ہو سکے۔ روزہ احساسات کا عملی مظاہرہ ہے کہ [illegible] شرب [illegible] جنسی خواہش کی تکمیل کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے جو ہماری [illegible] توجہ کی طالب ہے۔ روزہ نام اس کا ہے کہ آدمی [illegible] وقت سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جنسی [illegible]

کے پورا کرنے سے رکا رہے۔ لیکن ذہنی روح کے اعتبار سے روزہ جیسی چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنی خواہشات پر قابو ہو اور اسے تقویٰ کی زندگی حاصل ہو۔ اسی حقیقت کے پیش نظر بعض علماء نے کہا ہے کہ بہت سے روزہ دار مفطر کے حکم میں ہوتے ہیں اور بہت سے مفطر روزہ دار کے حکم میں آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ کتنے آدمی بظاہر روزے سے ہوتے ہیں لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کا روزہ نہیں ہوتا۔ تقویٰ اور پاکیزگی کی زندگی انہیں حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صائم نہ ہونے کی حالت میں بھی حقیقت کے اعتبار سے صائم ہوتے ہیں۔ ان کے کان غیبت سے نا آشنا، ان کی نگاہیں عفیف اور پاکیزہ اور ان کی زندگی پاکیزگی اور خدا ترسی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ بات اگر ہم کو حاصل نہیں ہو سکی تو گویا ہم نے سرے سے روزہ ہی نہیں رکھا۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔"

تشبہ بالملائکہ | روزہ میں انسان کو فرشتوں سے ایک طرح کی مشابہت حاصل ہو جاتی ہے۔ فرشتے کھانے پینے کی ساری ضرورتوں سے مستغنی ہیں۔ خدا کی تسبیح و تقدیس ہی ان کی غذا ہے۔ روزہ میں انسان بھی خواہشات نفس سے کنارہ کش ذکر خدا کی اطاعت و عبادت میں مصروف ہوتا ہے۔

جہاد کی روح | حق سے محبت اور باطل سے نفرت انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ حق سے محبت کا حق انسان سے اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جبکہ اسے اپنی قوتوں اپنی خواہشات اور اپنے جذبات پر قابو حاصل ہو جو اسے راستی سے ہٹا کر باطل زدہ بنا دیتے ہیں۔ انہی قوتوں پر قابو پانے کے لئے مجاہدہ اولین شرط ہے۔ روزہ رکھ کر انسان اپنے نفس سے جہاد شروع کر دیتا ہے

اس شخص سے جو اپنے نفس کو زیر نہ کر سکے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ حق کی حمایت اور باطل کے استیصال کے لئے جان توڑ کوشش کر سکتا ہے۔ صبر و عزیمت کے بغیر جہاد ممکن نہیں اور صبر و عزیمت روزے کی خصوصیات میں سے ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے مہینے کو "صبر کا مہینہ" فرمایا ہے۔

ہمدردی و مواسات | روزے سے صاحب ثروت شخص کو بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ بھوک اور فاقے سے انسان کا کیا حال ہوتا ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی میں انسان کو دوسروں کی تکلیف اور ہمدردی کے جذبے سے یکسر محروم کر جائے۔ روزے کی حالت میں آدمی کو بھوک پیاس کا عملی تجربہ ہوتا ہے۔ اس طرح آدمی کے اندر فطری طور پر یہ احساس ابھرتا ہے کہ وہ ناداروں اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے اور انہیں ان کی پریشان حالی میں نہ چھوڑے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینے کو "مواسات" کا مہینہ فرماتے تھے اور اس مہینہ میں آپ بہت زیادہ فیاض ہوتے تھے۔

خدا کی عظمت کا اظہار | روزہ خدا کی بڑائی اور عظمت کا مظہر ہے۔ رمضان کے مہینے میں ایک طرف بندے کی عبدیت اور عاجزی کا مظاہرہ ہوتا ہے، دوسری طرف خدا کی آقائی اور بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔

شکر گزاری | روزہ جس طرح سراپا تقویٰ اور حصول تقویٰ کا قریب ترین ذریعہ ہے، اسی طرح وہ سراپا شکر گزاری بھی اور اس میں لوگوں کو اللہ کا شکر گزار بندہ بنانے کی خاصیت بھی پائی جاتی ہے۔ روزہ کے ذیل میں جہاں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو) فرمایا گیا ہے وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرہ) اور تاکہ اس ہدایت پر جو تمہیں بخشی ہے اللہ کی

ہدایت عطا کی ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

روزہ مقدس ترین عبادت ہے۔ اس کی حیثیت محض تربیتی کورس کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ اظہار شکر کا ذریعہ بن سکا بنی نوع انسان پر خدا کے احسانات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں قرآن جیسی نعمت سے نوازا۔ قرآن بندوں کے لئے سب سے بڑی نعمت اور رحمت ہے۔ قرآن نے انسان کو حیات ابدی اور دائمی فلاح کا راستہ دکھایا۔ انسان کو اخلاق کے اس بلند مرتبے پر کھڑا کیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روزہ رکھ کر بندہ اس نعمت پر خوشی اور شکر گزاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ انسانوں کے عید و شرف کی اصل چیز حقیقت میں وہ تعلق اور نسبت ہے جو اس کے اور خدائے برتر کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ہزار جان گرامی فدا بایں نسبت

انسانوں کے خوشی اور مسرت کے اظہار کا بہترین اور کامل ذریعہ وہی ہے جس سے بندے اور خدا کے درمیان پائے جانے والے تعلق اور نسبت کا اظہار ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عیدین کے موقع پر اپنی خوشی کا اظہار ہم خاص طور پر تکبیر اور نماز کے ذریعہ کرتے ہیں۔ یہ نماز اور تکبیر مسرت کا اظہار بھی ہیں اور خدا کے حضور بندے کی طرف سے ادائے شکر بھی۔ اسی طرح روزہ بھی شکر کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے خدا نے قرآن نازل فرما کر بندوں پر اپنی نعمت تمام کردی۔ بندے بھی اس کی خوشنودی اور شکر گزاری میں روزہ رکھتے اور کامل طہارت اور پاکی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

عاجزی اور خاکساری روزہ سراپا عاجزی و خاکساری کا اظہار بھی ہے۔ اسی لئے کفارہ وستیآت میں روزے کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ شریعت میں کفارہ کے طور پر بھی روزہ رکھنے کا حکم آیا ہے۔ قدیم صحیفوں میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ روزہ سراپا عاجزی و خاکساری ہے اس لئے دعا کی قبولیت اور اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں اس کا بڑا دخل ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"............ اور خداوند اپنے لشکر کے سامنے للکارتا ہے کیونکہ اس کا لشکر بے شمار ہے اور اس کے حکم کو انجام دینے والا زبردست ہے کیونکہ خداوند کا روز عظیم اور بہت ہی خوفناک ہے۔ کون اس کی برداشت کر سکتا ہے؟ لیکن خداوند فرماتا ہے اب بھی پورے دل سے روزہ رکھ کر اور گریہ و زاری اور ماتم کرتے ہوئے میری طرف رجوع لاؤ اور اپنے دلوں کو نہیں بلکہ دلوں کو چاک کر کے خداوند اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو کیونکہ وہ رحیم و مہربان قہر میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔" (یوئیل ۲: ۱۱-۱۳)

ہمارا روزہ آج ہم روزہ رکھتے ہیں پھر بھی اس سے وہ نتائج حاصل نہیں ہوتے جو فطرتاً اس سے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی وجہ حقیقت میں یہ ہے کہ ہم روزہ تو رکھتے ہیں مگر اس کے پورے آداب شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتے روزے میں کھانے پینے سے تو ضرور رک جاتے ہیں لیکن ان بہت سی باتوں سے نہیں رکتے جن سے خاص احتراز کا حکم دیا گیا ہے۔ بظاہر ہم روزے سے ہوتے ہیں مگر ہمارے تمام اعضاء و جوارح اور ظاہری و باطنی قوی اور جذبات صائم نہیں ہوتے۔ نہ تو ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی شرمگاہ اور دل کو منکرات سے روکتے ہیں اور نہ ہماری زبانیں بدگوئی، غیبت اور کذب و افترا سے محفوظ رہتی ہیں۔ ہمارے کان معصیت کی طرف بلانے والی آوازوں کو سنتے ہیں اور ہمیں کھانے پینے، لین دین اور دیگر معاملات تک میں حلال و حرام کا بہت کم خیال ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم روزے سے ثمرات و برکات کی توقع رکھتے ہیں تو یہ ہماری نادانی ہے۔ روزہ تو

درحقیقت وہی ہے جس میں اس کے آداب کا پورا لحاظ رکھا جائے اسکے ذریعہ زندگی میسر آسکتی ہے جسے تقویٰ اور احسان شناسی کی زندگی کہا جا سکے۔

قدیم صحائف میں بھی ایسے روزوں کو بے وقعت قرار دیا گیا ہے جس کا تقویٰ، اخلاص نیت اور اعلیٰ اخلاق سے کوئی تعلق نہ ہو۔ نبیوں کے فقرے کس قدر موثر ہیں۔

"دیکھو تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ جھگڑا رگڑا کرو اور شرارت کے مکے مارو۔ پس اب تم اس طرح کا روزہ نہیں رکھتے ہو کہ تمہاری آواز عالم بالا پر سنی جائے کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن کہ اس میں آدمی اپنی جان کو دکھ دے اور سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے کیا تو اس کو روزہ اور ایسا دن کہے گا جو خداوند کو مقبول ہو؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں کہ ظلم کی زنجیریں توڑیں اور جوئے کے بندھن کو کھولیں اور مظلوموں کو آزاد کریں بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالیں۔ کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنائے اور تو اپنے ہم جنس سے روپوشی نہ کرے؟ تب تیری روشنی صبح کی مانند پھوٹ نکلے گی اور تیری صحت کی ترقی جلد ظاہر ہوگی تیری صداقت تیری ہراول ہوگی اور خداوند کا جلال تیرا چنڈاول ہوگا ...... اور اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ دل کو آسودہ کرے تو تیرا نور تاریکی میں چمکے گا اور تیری تیرگی دوپہر کی مانند ہو جائے گی۔" (یسعیاہ ۵۸ : ۴-۱۰)

"خبردار اپنے راستبازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو نہیں تو تمہارے باپ کے پاس جو آسمان پر ہے تمہارے لئے کچھ اجر نہیں ہے" (متی ۶ : ۱)

(۱) اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ ان کو روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔ (متی ۶ : ۱۶-۱۸)

اگر روزے سے واقعتاً فائدہ اٹھایا جائے تو وہ اس کو اس مقام پر کھڑا کر دیتا ہے کہ اسے ہر وقت اپنی ذمہ داری کا احساس رہتا ہے۔ اس کے شب و روز کبھی بے خوفی اور بے پروائی میں بسر نہیں ہوتے۔ شاید آپ نے کبھی ان عورتوں کو دیکھا ہوگا جو کنویں سے پانی بھر کر گھروں میں پہنچاتی ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ پانی سے بھرا ہوا ایک گھڑا سر پر ہے اور بغل میں بھی۔ پانی کا گھڑا لئے ہوئے راستے میں کوئی جان پہچان کی عورت مل گئی تو رک کر اس سے باتیں بھی کر لیتی ہیں۔ گفتگو کے وقت دیکھا گیا ہے کہ گھڑا سر پر ہے، ہاتھ اس سے الگ کئے ہوئے ہیں کیا مجال کہ سر سے گھڑا گر جائے۔ بلا سے وہ گفتگو میں مصروف ہوتی ہیں لیکن ان کی توجہ گھڑے کی طرف سے ہٹنے نہیں پاتی۔ انہیں اپنے گھڑے کا پورا خیال رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ گھڑا گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ روزہ کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے اس میں بھی آدمی کو ہر وقت اس کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ روزے سے ہے۔ وہ اپنے روزے سے غافل نہ ہو۔ روزے کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھے۔ کامیاب ہے وہ شخص جس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اس کی ذمہ داری صرف روزے کے ظاہری آداب و شرائط کی نگہداشت تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے آگے یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ روزے کے اصل مقصد سے غافل نہ ہو۔ آپ جانتے ہیں

روزے کی جو اصل غرض و غایت ہے وہ صرف تقویٰ ہے۔ چم

جماعت اسلامی کیوں بنی؟

حافظ محمد جمال احمد

مذہبی لوگ یہ سوال اٹھاتے رہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کیوں بنی میں کہتا ہوں یہ کیوں نہیں پوچھتے گھٹا کیوں اٹھی بادل کیوں چڑھے بارش کیوں ہوئی۔ اس پورے کرہ ارضی کو سینچنے کیلئے پیڑ پودوں کو پھلنے پھولنے کیلئے چرند و پرند اور انسان کو ایک ایک بوند پانی کو ترسنے اور تڑپ تڑپ کر جان دینے کیلئے کیوں نہیں چھوڑ دیا گیا پھر یہ کیوں نہیں سوال کرتے انبیاء کیوں بھیجے گئے آسمانی کتابیں کیوں نازل کی گئیں۔ نوع انسان کو بھٹکنے اور ضلالت و گمراہی کے غار میں گرنے مظلوم کو کچلنے اور ظالم کو قتل و غارت گری کرنے بے حیائی و بدکاری کو عام ہونے اور دنیا کو بھیڑیوں کا جنگل بن جانے کیلئے کیوں چھوڑ نہیں دیا گیا۔

حکومت وقت کی طرف سے ایک شخص کو طبی اصولوں سے پوری طرح واقف کرا دیا جاتا ہے حفظان صحت کے سارے قواعد و ضوابط بتا دیئے جاتے ہیں۔ علاج کے طریقے اور بیماریوں سے بچنے کی تدابیر ظاہر کر دی جاتی ہیں۔ پھر دواؤں کا اسٹاک دے کر ایک آبادی میں متعین کر دیا جاتا ہے۔ بیماروں کا علاج کرے لوگوں کو حفظان صحت کے اصولوں سے واقف کرے۔ تاکہ لوگ صحت مند توانا رہ کر بیماریوں کا شکار نہ ہو کر اپنی آبادی کی تعمیر و ترقی کیلئے بہتر خدمت انجام دے سکیں۔ لیکن وہ ڈاکٹر دواؤں کو خوبصورت الماریوں میں مقفل کر دے اپنی ذمہ داری کو یکسر فراموش کر دے۔ دوسروں کو اصول صحت بتانے کے بجائے خود ہی اصولوں کو توڑنا شروع کر دے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ پوری آبادی کے لوگ بیماریوں کا شکار ہو جائیں ڈاکٹر خود ہی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ تو کیا حکومت اس سے مواخذہ نہ کرے گی اور وہ سخت باز پرس سے بچ جائے گا۔

اسی طرح ایک فوجی دستہ جو ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس کر کے ایک شہر کی حفاظت پر تعینات کیا جاتا ہے تاکہ شہر کے لوگ اطمینان و سکون کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اور انہیں کسی چور، ڈاکہ زنی اور کسی ڈاکٹر اور ڈاکو کا کھٹکا نہ رہے لیکن وہ فوجی دستہ اپنی ذمہ داری کو فراموش کر کے شراب و کباب میں رقص و سرود میں محو ہو جائے اتنا ہی نہیں بلکہ خود لوگوں کی جان و مال عزت و آبرو پر دست درازی کرنے لگے۔ تو کیا وہ فوج حکومت کی نظر میں محفوظ رہ سکے گی۔ ٹھیک اسی طرح سے مسلمانوں کو خلافت کی طرف سے نگہبانی زندگی کے انتظام اور اس زمین کو ہر طرح کے بگاڑ فساد اور بگاڑ اور ظلم سے بچانے

اور شیطان کے ہر حملے سے بچاتے اور انکی رہنمائی و
ہدایت کیلئے انبیاء علیہم السلام ہر ملک اور ہر زمانے میں
بھیجے جاتے رہے۔ اور وہ اہل عالم کو سلامتی کی راہ دکھاتے
رہتے۔ فتنہ و فساد سے دور رہتے اور صراط مستقیم پر چلنے
کی تلقین کرتے رہتے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اللہ
کے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ کا
دیا ہوا ایک مکمل نظام حیات، جس کا نام اسلام ہے لیکر
تشریف لائے۔ اللہ کی آیات نازل ہوتی رہیں اور محمد
صلی اللہ علیہ وسلم اس کی قولی و عملی تفسیر پیش کرتے رہے
۲۳ برس تک آپ یہ فریضہ انجام دیتے رہے جسکے نتیجے
میں پورا ملک عرب حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اسلام بحیثیت
ایک نظام زندگی کے تسلیم کر لیا گیا۔ عرب جو ہر طرح
کی برائیوں کا گروہ تھا جہاں امن و سکون غارت ہو چکا
تھا۔ ظلم و جبر کا دور دورہ تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس
کا ڈنکا پٹ رہا تھا۔ وہی عرب اب ایک ایسا مثالی سماج
دنیا کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ جس کی نظیر آج تک تاریخ
پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا ویلفیئر اسٹیٹ قائم ہوا کہ
دنیا ایسا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی
اب آخری رسول اپنا کام پورا کر کے دنیا سے تشریف لے
جا چکے ہیں۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا
نہیں ہے۔ اب یہ کام نبوت کون انجام دے گا۔ محمد نے
ایک امت چھوڑی ہے۔ جسے اللہ کی کتاب اور اپنی
سنت دیکر یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ اب یہی فریضہ
شہادت حق یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو کام انبیاء کرتے
چلے آ رہے تھے۔ یہ امت مسلمہ کرتی رہے گی آپ کے
بعد یہ کام خلفاء راشدین ٹھیک اسی طریقے سے انجام
دیتے رہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ امت میں زوال
آتا رہا۔ گو یہ وقتاً فوقتاً افراد اٹھتے رہے۔ اور امت کو جھنجھوڑ
کر بھولا سبق یاد دلاتے رہے۔ لیکن [illegible]

تھدہ۔

واتے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

امت زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ
وقت بھی آگیا کہ جانشینان انبیاء مدرسوں میں، خانقاہوں
میں روپوش ہو گئے۔ اقدام کے بجائے دفاع میں لگ
گئے۔ ادھر ابلیس نے اپنی فوج تیار کی۔ ہر محاذ پر حق کو
چیلنج کیا۔ کہیں اشتراکیت کا جال پھیلایا کہیں لادینی جمہوریت
کو ابھارا۔ کہیں قوم پرستی کو ہوا دی۔ حتی کہ اس کی روح خانقاہوں یا
عبادت گاہوں، مدارس و اقتدار کی گدیاں بھی محفوظ نہ رہیں
بیسویں صدی کے اواخر تک ابلیس لعین کا کام مکمل ہو چکا
تھا۔ ہر ملک اسی کا قانون چلنے لگا اسی کا راج تھا۔ جگہ جگہ
محفلیں منعقد کی گئیں نیز [illegible] تقسیم ہوئیں۔ ابلیس اور اس کی
اولادوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

لیکن مشیت کو یہ چیز کب تک برداشت ہو سکتی
تھی۔ بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ تھا۔ جنوبی ہند
کے افق پر سپیدہ سحر نمودار ہوا ایک نور ابھر رہا تھا۔
نور حق کی کرنیں ضیا پاشی کیلئے بیتاب تھیں۔ ایک صالح نوجوان
تھا جو اندھیرے کو دیکھ کر تڑپ جاتا ہے اس کی
آنکھیں دیکھتی ہیں متاع حیات لٹ رہی ہے۔ بیدار
محو خواب ہیں۔ قزاقوں کا گروہ کھلیں کھیل رہا ہے۔ وہ شخص
کہ ہر شیطان کا تسلط ہے۔ سونے والوں کو جگاؤں
گا۔ شیطان کا طلسم توڑوں گا۔ یہ اندھیرا مٹا کے رہوں گا۔
ابلیس کے تخت و تاج کو الٹوں گا۔ یا تو پوری دنیا پر حق قائم
کر دوں گا یا اپنی جان اسی میں کھپا دوں گا۔ خدا کی قسم اگر
کسی نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں اکیلا ہی آخری سانس تک
پکارتا رہوں گا۔

اور اس نے ترجمان القرآن کے ذریعہ صدا لگانی شروع
کر دی۔ یہ وہی صدا تھی جو صفا کی پہاڑی پر لگائی گئی تھی۔

یہ وہ کیا ضرب تھی جو کفر کی تجوریوں میں لگائی گئی تھی جو طاقت کے بازاروں میں لگائی گئی تھی۔

یہ وہ ضرب تھی جس نے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا۔ اسلام اور جاہلیت کا فرق واضح کردیا۔ بتایا کہ جاہلیت خالص کیا ہے۔ مذہب کا رخ کیا ہے اور جاہلیت راہبانہ کیا ہے بتایا کہ اسلام کے سوا جتنے نظریات بھی دنیا میں چاہے وہ اشتراکیت ہو۔ چاہے سیکولر جمہوریت ہو چاہے تحریر شدہ نظریہ جو سب کی بنا نفسانیت، دنیا پرستی اور جہالت پر ہے قیاس و گمان پر ہیں یقینی ذریعہ علم کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اور نہ کہا جاسکتا ہے کوئی نظریہ انسانی مسائل کو حل کرسکتا ہے۔ البتہ دنیا میں امن و سکون، عدل و انصاف کی ضمانت اگر دے سکتا ہے۔ تو وہ اسلام ہے جس کی بنا خدا پرستی اور یقینی ذریعہ علم پر ہے۔ سارے باطل نظریات کا باطل ہونا اور میدان حیات میں ناکام ہونا اس طرح واضح ہوا ثابت کردیا۔ کہ ان سب کی جڑوں پر اس قدر ضرب کاری لگائی کہ جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ اشتراکیت کے علمبردار کو کھلا اسکے لادینی جمہوریت اور قوم پرستی کا راگ الاپنے والے بدحواس ہوگئے۔ حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا۔ صوفیا کو اپنے تصوف کا محلوں کو اپنی رہبانیت کا پاپائیت کا پیروں کو اپنی گدی کا سرمایہ داروں کو اپنی جمع دولت کا خطرہ نظر آیا غرضکہ ایک ہی صدا میں سب نے اپنی اپنی ہلاکت کا پیغام سنا۔ ابلیس کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ارے یہ آواز کہاں سے آرہی ہے یہ تو وہی آواز ہے جو ڈیڑھ ہزار برس پہلے محمد ﷺ نے لگائی تھی سرمایہ داروں نے کہا یہ مزدوروں کا ساتھی ہے [illegible] کہا یہ سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ مذہب کے ٹھیکیداروں نے کہا یہ تو تصوف کا قائل نہیں بزرگوں کی توہین کرتا ہے منکر حدیث ہے قرآن کی من مانی تفسیر بیان کرتا ہے [illegible] کا دعویٰ کرنے والا ہے غرض اسکی

دعوت میں ہر ایک کو اپنے لیے خطرہ نظر آیا مذاہب اور [illegible] پیشہ ور یا صاحبانِ کشف و کرامت اپنی دکانوں اور خانقاہوں سے اس آواز کو دبانے اس کا گلا گھونٹ دینے اور اس نورِ حق کو بجھانے کیلئے آگے بڑھے لیکن [القرآن] نے آواز دی یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواہہم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

[illegible]

چراغ کی لو تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اور اس کی [illegible] اثرات سینے میں ارتعاش پیدا کردی۔ [illegible] سعید روحیں بیدار ہوئیں۔ اس کی آواز پر لبیک کہا گیا [illegible] کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ [illegible] اعلان کردیا فلاں مقام پر فلاں تاریخ میں لوگ آجائیں [illegible] مقام متعینہ پر وقت مقررہ پر لوگ اکٹھا ہوگئے۔ [illegible] افراد تھے علماء تھے شیوخ تھے۔ [illegible] سوسائٹی کے کریم تھے۔ اہل دانش تھے۔ ارباب علم و عقل تھے۔ وقت کے [illegible] تھے۔ [illegible] کا احساس رکھنے والے تھے جن [illegible] کا انتظار تھا۔ جو صدا لگائی گئی تھی [illegible] دل کی آواز تھی [illegible] کی عظمت اور [illegible] کا احساس تھا۔ سرجوڑ کے بیٹھے [illegible] فیصلہ [illegible] واحد آواز کہہ رہا تھا۔ میں نے دعوت دی ہے۔ مجھے امیر [illegible] [illegible] کروں گا [illegible] [illegible] انقلاب ہوگیا [illegible]

خرافات زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ اور بارگاہ ایزدی میں
ندامت کے آنسو آنکھوں سے جاری تھے۔ بڑا عجیب
سماں تھا۔ یہ کام دنیادار نہیں سمجھ سکتے یہ وہ کام ہے۔ جس کیلئے
دل و دماغ کے ساتھ ساتھ پیار محبت بھی لازمی ہے۔ یہ جذبہ
محبت ہی ہے جو محبت سے جگا سکتا ہے اور دشمن بھی اپنی غلط
روش ترک کر سکتا ہے۔ یہ دل کی موت ہے۔ جس کیلئے ایمان اور
آگ میں کودنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا کیونکہ
آگ سے پہلے۔

یہ عشق جہاں آسماں لیس ...... تھے پہلے
آگ ڈھنگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
اسی کیلئے تو قرآن نے پہلے کہا تھا
ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل
الذین خلوا من قبلکم مستھم البأساء والضراء
وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا
معہ متی نصر اللہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جماعت بن گئی اور اس کا نام جماعت اسلامی رکھ دیا کیونکہ
یہ جماعت اسلام کے نفاذ اور احیاء کیلئے بنائی گئی
ہے اور اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اسلامی جماعت
دین کی جماعت کہلاتی ہے یہ تو وہی ہے۔ جس کی تشکیل
دو جناب محمد رسول اللہ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی
جو کچھ ہوا حق تعالیٰ کی یاد کا ہے۔ یہ دین کی جماعت ہے
جو قرآن نے کنتم خیر امة اخرجت للناس سے خطاب
کیا ہے۔ ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ... ہی تو
ہے۔

البتہ یہ داد اور منصفانہ جائزہ ضروری ہے۔ جماعت کی
تنظیم اور اس کی تحریک کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن دونوں نے
جہاد کا جذبہ اور حوصلہ اس جماعت کو دیا ہے اپنے

دیا۔

اب اُن کا کارواں یہ لکھا ہے تھے پہنچیں
وہ ہم سفر جو چلے ساتھ تھے جدا ہو گئے
لیکن کہیں آگے قافلہ بڑھ کے پہنچے گیا۔
ہم تیرے ساتھ ساتھ ہیں آ عشق ستاں
کچھ فکر نہ کر کون بنا گرد کارواں

یہ پوچھتے ہو جماعت اسلامی کیوں بنی۔ میں کہتا ہوں اگر
یہ جماعت نہ بنتی تو کیا ہوتا۔ پاکستان میں نظام مصطفیٰ کی
تحریک انقلاب ایران یہ مختلف ملکوں کی اسلامی تنظیمیں یہ سب
کس چیز کا نتیجہ ہیں۔ شاید یہ لوگ دنیا کے حالات سے
ناواقف ہیں بند کئے ہوئے ہیں۔ سچے تو آج یہ اسلامی تحریک کو
کسی کی نصیحت کی یاد آ رہی ہے۔ کہ ایک دن ایسا آئے گا
کہ کمیونزم ماسکو میں اپنی بربادی پر نادم ہو گا۔ اور سیکولرازم
امریکہ میں پناہ نہ دے سکے گا۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

کام کرنے کا جذبہ ہے اور تھا۔ اب اگر کوئی کہتا ہے یہ
کام تو نئے کیوں شروع ہوئے اور ایک نئی جماعت بنائی گئی میں
کہتا ہوں۔ اگر یہ کام ہو رہا ہوتا۔ تو یقیناً ہم اس میں شامل ہو
جاتے۔ آج بھی اگر کوئی جماعت یہی فریضہ اقامت دین
ادا کرنے کیلئے آگے بڑھے۔ تو وہ اس کا سب سے پہلے اس
میں شامل ہونے کیلئے ہم آگے بڑھیں گے۔ کیونکہ ہم ملت
کو تفرقہ سے بچانا چاہتے ہیں۔ لیکن جب ہم نے دیکھا کہ
دنیا کے نام کی تنظیمیں بہت ہیں۔ مگر کوئی کلمے کے الفاظ
درست کر دیتا ہے۔ معافی سے کچھ مطلب نہیں فضائل
گنوانے بیان ہو رہے تھے حق کو پیش نظر اکیلا ہی سب
کو یہ بیان کرتے ہوئے ناکام کر گئے ہوئے اگر کسی کشتی
کی تقدیر کا عالم یہ پڑا ہاتھ تو وہ بچ جائے۔ ورنہ ہو گا کی
غرق کوئی جماعت اپنا سہارا بنا کر خلافت الامام ...

بالجہر اور رفع یدین پر صرف کر رہی تھی۔ اور کسی نے تو نجات کا دارومدار محفل میلاد منعقد کرنے نعت شریف اور قوالیوں پر اور اصحاب قبور کو علی الاعلان شفعاءنا عند اللہ ماننے پر رکھا تھا۔ ازراہ انصاف بتایئے۔ ان میں سے کسی تنظیم یا جماعت میں خیال ہو کہ وہ فریضۂ نبوت ادا ہوتا۔ ہاں ایک غلطی کا اقرار ہے۔ یہ کام کسی مستند عالم کے مبارک ہاتھوں سے شروع ہونا چاہیئے تھا۔ یا کم از کم کسی شیخ طریقت سے بیعت ہی ہو گئے ہوتے۔ اور باقاعدہ اجازت مل جاتی۔ رفقاء محترم! جماعت اسلامی کو مقبول عام بنانے کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ کہ آپ کا مقصد واقعتاً اخلاص کے ساتھ رضائے الٰہی ہی ہو جائے۔ اسکی راہ میں سب کچھ قربان کرنے کا عزم صادق رکھتے ہوں۔ آپ خود مسلمان بنئے اپنے گھروں کو مسلمان بنایئے۔ اپنے اہل وعیال کی صحیح تربیت کیجئے قول وعمل کے تضاد اور منافقانہ روش سے اپنی زندگیوں کو پاک کیجئے۔ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو مسلمان ڈاکٹر بنئے تاجر ہیں تو مسلمان تاجر بنئے۔ کسان ہیں تو مسلمان کسان بنئے۔ مسلمان پڑوسی بنئے مسلمان باپ بنئے مسلمان شوہر بنئے۔ مسلمان معلم بنئے۔ غرض جہاں کہیں بھی ہوں جس میدان میں بھی ہوں۔ آپ کو پہچانا جا سکے۔ آپ کے ذہن ودماغ پر دنیا پرستی کا نہیں آخرت پسندی کا غلبہ ہو آپ دنیا کے نہیں آخرت کے حریص ہوں پھر آپ اقامت دین کو واقعی اپنا نصب العین بنالیں۔ اور دین کے غلبہ کیلئے سر بازی کھیلنے کیلئے تیار ہو جائیں تو پھر اس تحریک کو آگے بڑھنے اور مقبول عام ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

پھر آپ یقین رکھیئے یہاں ناکامی کا تو سوال نہیں دوسری راہوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کہاں تک پہنچے اور منزل کتنی باقی ہے کامیابی کے امکانات کا حساب لگایا جاتا ہے لیکن ہماری کامیابی کا معیار یہ ہے کہ جس نیت اور اخلاص کس قدر تھا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کتنے ڈگ چلے پہلے قدم پر موت آگئی۔ تب بھی کامیاب ہے۔ اور منزل تک پہونچ گئے تو کہنا ہی کیا ہے ایمان خالص اس سفر میں زاد راہ ہے عزم صادق راحلہ ہے۔ جو اپنی جانیں اللہ کی نذر کر چکے وہ کامیاب ہو چکے جو باقی ہیں وہ ہر لمحہ نذر گزران رہے ہیں۔

رجالٌ صدقوا ما عاہدوا اللہ علیہ فمنہم من قضیٰ نحبہ ومنہم من ینتظر

بقیہ صفحہ ۲۳ کا

روزے کے زمانے میں مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کے پورے ... بات سے ہے۔

آپ کے مشورے

تمنا ہے! آپ کے قیمتی مشوروں کی ہمیں بیحد ضرورت ہے

★ حیات نو کو معیاری اور بہتر بنانے کے سلسلے میں

★ حیات نو کے خصوصی نمبرات کے سلسلے میں۔

★ حیات نو کو مالی لحاظ سے مستحکم بنانے کے سلسلے میں

ہمیں آپ کے تحریری مشوروں کا انتظار رہے گا۔ شکریہ (ادارہ)

حیات نو کی اشاعت میں بھرپور حصہ لے کر ہمارا تعاون فرمائیں

مولانا مقبول احمد ندوی

شاد قادری

ایک اسلام پسند شاعر

شعر و ادب کو ابتداء اسلام ہی سے ایک خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور خود نبی کریم ﷺ نے بارہا اچھے اشعار پر داد دی ہے یا اگر کسی شعر میں کوئی سقم ہوا ہے تو آپ نے اس کی اصلاح فرمائی ہے چنانچہ سیرت نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ جب آپ کے سامنے عربی کا مشہور شعر

> الا کل شیء ما خلا اللہ باطل
> و کل نعیم لا محالۃ زائل

(ترجمہ: جان لو کہ بجز ذات خداوندی ہر شے فانی ہے اور ہر نعمت بہر صورت ختم ہونے والی ہے) پڑھا گیا تو آپ نے فرمایا "سوی الجنۃ" یعنی جنت کے سوا ہر نعمت ختم ہونے والی ہے۔

اسی طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ جب اہل مکہ کی دشنام طرازیاں اور ہرزہ سرائیاں انسانی تہذیب و تمدن کی تمام حدوں کو پار کر گئیں تو آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا۔ مختلف صحابہ نے جو جانے پہچانے شاعر تھے اپنے آپ کو پیش کیا اور اپنی خدمات پیش کیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمیں حکم دیجئے ہم ان کے بخئے ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ آپ نے فرمایا تم یہ کیسے کر سکو گے جبکہ وہ میرے ہم نسب ہیں۔ حضرت حسان نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کو ان سے اس طرح نکال لیں گے جس طرح گوندھے ہوئے آٹے سے بال کو نکالا جاتا ہے۔ اور تاریخ گواہ ہے حضرت حسان نے اس نازک فریضہ کو بخوبی انجام دیا اور "شاعر رسول اللہ" کا پر فخر خطاب حاصل کیا۔

اسلام کی ترقی اور اسلامی سلطنت کے عروج کے ساتھ اسلامی شعر و ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ مگر ہر زمانے میں اسلامی شاعری کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مصلحت پسندی کا شکار نہیں ہوئی۔ وہ بڑی قربانی دے سکتی ہے مگر حق کو باطل اور باطل کو حق نہیں کہہ سکتی۔

عہد اموی کے مشہور شاعر فرزدق کا واقعہ میرے اس دعوے کی دلیل ہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ عبدالملک بن مروان جس کے رعب و دبدبے، قوت و سطوت، شان و شوکت، جاہ و حشم، تدبیر و سیاست پر تاریخ کے ہزاروں صفحات سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ فرزدق کے ہمراہ حج کر رہا تھا اور طواف میں مشغول تھا۔ چونکہ بھیڑ بہت زیادہ تھی اس لئے ہر چکر کے بعد حجر اسود تک پہنچنا دشوار تھا لیکن عبدالملک اس وقت حیران رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ ایک نحیف و زار

شخص حجر اسود کی طرف بڑھ رہا ہے اور باوجود کہ ایک دوسرے کی خبر نہیں لوگ اس شخص کو دیکھتے ہی کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں اور اس کو راستہ دے دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ بآسانی حجر اسود تک پہنچ گیا اور اس کو بوسہ دیکر پھر اسی شان سے واپس ہوگیا یہ بات عبدالملک کی رعونت کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی مگر ایسی صورت میں جب کہ وہ اس شخص کو پہچانتا بھی نہ تھا کیا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے فرزدق سے پوچھا یہ کون ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ فرزدق گرچہ عبدالملک کے مزاج سے بخوبی واقف تھا مگر امام زین العابدین رضہ کے بارے میں عبدالملک کے انداز سے وہ بہت دکھی ہوا لیکن وہ ایک شاعر تھا۔ اس نے عبدالملک کو ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ عبدالملک سسکتا رہ گیا۔ اس نے اپنے شعر کے ذریعہ عبدالملک کو تاریخ کے صفحات پر عریاں کر دیا۔ اس نے کہا:

هٰذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهُ
وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ
هٰذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللّٰهِ كُلِّهِمُ
هٰذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ
مَا قَالَ لَا قَطُّ إِلَّا فِي تَشَهُّدِهِ
لَوْلَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاءَهُ نَعَمُ ۱

(ترجمہ: یہ وہ ذات پاک ہے جس کے قدموں کی چاپ سے وادی بطحا بخوبی واقف ہے اور بیت اللہ (کعبہ) اور حل وحرم اس کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ یہ وہ ذات گرامی ہے جو بنی نوع انسان میں سب سے بہتر کی اولاد سے ہے۔ یہ پاکباز پاک طینت، پاک باطن اور نشان حق ہیں۔ یہ وہ مقدس ہستی ہے جس کے لبوں پر لفظ لا (نہیں) کبھی نہیں آیا۔ اگر کلمہ شہادت میں لا کا لفظ نہ ہوتا تو یہ کبھی نہ نہیں کہہ سکتے تھے۔)

اس نے یہ اشعار کہے اور عبدالملک کو عالم حیرت میں چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔

اسلامی تاریخ میں شعر و ادب کی موجودگی، اس کی حقیقت بیانی، یا عمل کی یہ وہ زریں کا سلسلہ ہیں، یہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اپنا تسلسل قائم رکھتا ہے اور مختلف ادوار میں مختلف شخصیات کے پیکر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کبھی رومی کی صورت میں جلوہ گر ہو کر چاروں سمت میں فکر اقبال کا انجام دیتا ہے تو کبھی جامی کی صورت میں عشق رسول کو رگ و پے میں جاری و ساری کرتا ہے اور کبھی سعدی کبھی خیام کبھی حافظ کے روپ میں زخمی انسانیت کے ناسور کی مرہم پٹی کرتا ہے اور حیات تازہ کا پیام سناتا ہے۔

زبان اردو اپنی ابتدا ہی سے اس قیمتی نعمت سے مالا مال رہی ہے، کیونکہ یہ زبان جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "اردو اور گجری کا رشتہ" میں تحریر کیا ہے اصلاً مبلغین اور صوفیاء کی زبان رہی ہے جو کہ ہر حال میں حق پسند و حق بین تھے۔ یہ عاشق رسول اور عاشق اللہ تھے اور اسی لئے یہ خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکتے بھی نہیں تھے بلکہ بڑے بڑے حکمرانوں کو ان کی غلطی پر متنبہ کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں نے اپنے جذبات و خیالات کو قلم بند بھی کیا ہے جس سے ان کے فکر اور اردو کی ابتدائی شاعری کے کیفیت کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

دور آخر میں علامہ اقبال مرحوم اس مکتب فکر کے امام آخر کی حیثیت سے سامنے آئے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر ملت اسلامیہ کو خواب خرگوش سے بیدار کیا اور اسے اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلا کر جہد مسلسل کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے کاروان علم و عمل کو آمادۂ سفر کیا۔

---

۱ منشورات من ادب العرب محمد رابع حسنی ندوی

شاد بدایونی بھی انھیں اعلیٰ روایات کے امین ہیں اور اسلام پسندی ان کے خمیر میں شامل ہے۔ وہ بنیادی طور پر صنفِ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں بھی کم لائقِ اعتنا نہیں ہیں بلکہ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ غزل کی تنگ دامانی کا شاکی ہوتے ہوئے انھوں نے نظم کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے تو اس کی تنگ دامانی کا شکوہ مجھے بھی ہے لیکن کلامِ شاد کے مطالعے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ غزل کے تنگنائے میں محصور ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضرورت ہے مطالعے کی اور اسی کے ساتھ عشق کے اس جذبے کی جو چراغ کے لئے تیل کا کام دے سکے۔ یہ ایک قلیل الوجود مگر قیمتی جذبہ ہے جس میں پایا جاتا ہے اسے چشمِ فنا سے نکل کر حیاتِ ابدی بخش دیتا ہے اور شاد اسی جذبے سے سرشار ہیں۔ ایک حدیث جو مدت دراز سے میرے پیشِ نظر رہی ہے اور میرے نزدیک بھی ادب کے جانچنے کا معیار بن سکتی ہے خواہ وہ نثر ہو یا شعر اس موقع پر مجھے یاد آرہی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً" وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْراً اور کہا ... "بیشک بعض اشعار آئینۂ حکمت ہوتے ہیں۔ اور تقریریں مسحور کن ہوتی ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ شاد کے اشعار یقیناً آئینۂ حکمت ہیں اور ساتھ ہی آئینۂ دہر بھی۔ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "آئینۂ جذبات" کیوں رکھا ہے یہ وہ جانیں مگر میرے نزدیک ان کا کلام ان کے جذبات کا آئینہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے اس زوال پذیر معاشرہ کا آئینہ ہے جس میں ہم سب رہتے ہیں۔ واقعی انھوں نے بڑے ہی جرأت انداز میں زمانہ کو آئینہ دکھایا ہے۔ ساحر نے کہا تھا

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر کی شاعرانہ عظمت میں ان کا خاص لہجہ اور دل میں اتر جانے والا انداز قابلِ صد ستائش لیکن مجھے یہ کہنے دیجئے کہ کبھی کبھی وہ سطحیت پر اتر آتے ہیں جیسا کہ ان کی نظم تاج محل ہے اور یہاں بھی انھوں نے اپنی تنگ ظرفی اور سطحیت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن شاد اس کے برخلاف غالب کے اس مسلک کے پیرو ہیں۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

چنانچہ انھوں نے جو کچھ زمانے سے پایا ہے اسے لوٹانے کا کبھی بھول کر بھی ارادہ نہیں کیا بلکہ ایک اعلیٰ ظرف انسان کی طرح کانٹوں کو بھی پھول سمجھ کر چن لیا۔ وہ ایک باشعور ذمہ دار، اور غیرت مند شخص ہیں اسی لئے وہ برائیوں کو گلے لگانے اور اسے شیرِ مادر کی طرح پی جانے کے قائل نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زمانہ کو آئینہ دکھانے کی جرأت کی ہے۔

یہ کوئی معمولی جرأت نہیں ہے ترقی پسندی اور جدیدیت کے دور میں جبکہ شاعری جزویست از پیغمبری نہ رہ کر مذموم مقاصد کے حصول کا آلہ اور ہتھیار بن گئی ہے۔ ایسی شاعری کرنا شاعر کو الگ تھلگ کر دینے کے لئے کافی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ شاد کا کلام جو اب سے بہت پہلے شائع ہو جانا چاہئے تھا اب منظرِ عام پر آ رہا ہے جبکہ جنگل کے خودرو بے فیض کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح اگنے والے

ڈرامے بے ربط و بے معنی، اوٹ پٹانگ ہانکنے والوں کے مجموعے پر مجموعے شائع ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

شاعری کے موجودہ رجحانات کو دیکھتے ہوئے شاد کی شاعری کچھ عجیب سی لگتی ہے کیونکہ آج شاعری کا معیار خوبی کلام اور صداقت بیان نہیں ہے بلکہ آج کا معیار یہ ہے کہ خوب رویوں اور خوش گلوؤں کے حلقے میں داخل ہو کر پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کے ننگے شہوت انگیز ناچوں اور فلموں کے فحش مناظر کے ساتھ کسی ملکۂ ترنم یا کسی شہنشاہ آواز و غنا کی مدد سے عوامی اور قومی مقبولیت حاصل کرے۔ اور یہی آج کے بیشتر شعراء کے نزدیک حاصل داد اور نعمت عظمیٰ ہے لیکن شاد کی شاعری ان لغویات سے مبرا و منزہ ہے اور صحیح معنوں میں شعر کہلانے کی مستحق ہے چنانچہ شاد اگر ایک طرف معلم اخلاق ہیں تو دوسری طرف معلم آداب بھی۔ ان کے کلام میں نزاکت خیال بھی ہے اور جدت و پاکیزگی بیان بھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کلام شاد کوئی پندنامہ یا وعظ و نصیحت کا دفتر ہے۔ وہ ایک درمیانی کڑی ہیں۔ ان کے یہاں قدیم مضامین حسن تصوف عبادت عشق ہجر و وصال کے ساتھ ساتھ عصر جدید کے مسائل بھی اپنی جگہ پاتے ہیں۔ چنانچہ اخلاقی اقدار کی پامالی، مذہب سے بے اعتنائی، مزدور، محنت، کسان، سرمایہ داری، خود غرضی، اپنوں بیگانوں کی قدر ناشناسی، دنیا کا انتشار، باہمی عدم اعتماد وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو آج کل عالمی شاعری کا اہم موضوع ہیں۔ شاد کے کلام میں جا بجا موجود ہیں لیکن وہ عام روش کے بجائے نئی راہیں اختیار کرتے ہیں: جو قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔ وہ کبھی کلاہ چودھری کو ہیچ گرد

کی پیروی میں مذہب کو افیم نہیں کہتے بلکہ مذہب کو انسانیت کی اساس، تہذیب و تمدن کا سرچشمہ اور مذہب کی متعین کردہ اخلاقی قدروں کی بقا کو انسانیت کی بقا سمجھتے ہیں۔

شاد حق پرست بھی ہیں اور حق بیں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جھوٹ، تصنع، ریاکاری، فریب دہی اور دھوکہ بازی کے بجائے حقیقت بیانی، صداقت پرستی، اتحاد، خود فراموشی اور خلوت گزینی جگہ جگہ نمایاں ہے۔

حیات انسانی کی کشمکش، فرصت کی کمی، کثرت مشاغل اس دور کے سلگتے ہوئے مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت اور توجہ کا حامل ہے۔ انسان انسان نہ رہ کر مشین کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اسے ہر دم یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ وہ کیا کرے، کیسے کرے۔ شاد نئے دور کے نئے انسان کی اس کشمکش کو دیکھتے ہیں اور اس کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

پاس عقبیٰ بھی خیال خاطر دوراں بھی ہے
چار دن کی زندگی سرمایۂ انساں بھی ہے

مذکورہ بالا شعر میں اس حقیقت کی طرف بھی واضح اشارہ موجود ہے کہ مذہب اور جدید دور کا انسان کس طرح متصادم ہے۔

دنیا کے ہر شاہکار کی اساس کسی فن کار کے لہو پر ہے۔ اہرام مصر، مونا لیزا، تاج محل اور دنیا کے دوسرے تمام ہی پارے اس کی مثال ہیں۔ شاد نے اس بات کو کس خوبصورت انداز میں شعر کا قالب عطا کیا ہے ؎

ہر اک نقش جہاں میں چاہتا ہے ایک قربانی
نکھرتا ہے گلوں کے خون سے رنگ چمن اب بھی

حق و باطل کی کشمکش ہر زمان و مکان میں موجود رہی ہے

اور دونوں ہی اپنے چاہنے والوں سے قربانی کے طلب گار
رہے ہیں اور آج بھی

دے رہا ہے بجز زبانہ دعوت فکر و عمل
اک ذرا پھر امتحان قوت باطل بھی ہو

مزدوروں کا استحصال ایک عالمی مسئلہ ہے اور آج
کی ترقی یافتہ دنیا اس باب میں کسی طور سے کل کے عہد
غلامی کے جاگیرداروں اور جابر بادشاہوں سے کم نہیں ہے
گویا شراب تو پرانی ہے فرق صرف نئی پرانی بوتلوں کا ہے

زردار چکائے ہیں مزدور کا خون اب بھی
دنیا ہے نئی لیکن تہذیب پرانی ہے

سب آسائش کی فراوانی اور اس کی رنگارنگی
انسان کو سکون بخشنے سے قاصر ہے۔

افسانۂ حیات بعنوان اضطراب
دیکھو جسے جہاں میں وہی بیقرار ہے

یا پھر سے

دسکون ہے شکیب ہے یہ سب افتراق فریب ہے
جہاں ہر بہار خزاں بکف یہاں ہر نشاط الم نما

خودداری و خود بینی دو متضاد چیزیں ہیں ایک نہایت
محبوب دوسری نہایت مکروہ و ناپسندیدہ لیکن دونوں
کے درمیان فرق صرف اہل نظر کر سکتے ہیں۔

خود مانگ کے پینا مرے مشرب میں گنہ ہے
ساقی نہ مری جرأت رندانہ سمجھ لے

عاشق کے لئے معشوق کی نظر اکسیر کی حیثیت رکھتی
ہے اور ساقی کی ہر نظر عاشق کو نئی نئی دنیاؤں کی سیر
کراتی ہے۔

زندگی ہر قدم کی منزل سے گذر جاتی ہے
ہر نظر آپ قیامت کی نظر رکھتی ہیں

دنیا کا رخ پلٹنے کے دعویدار دوسرے سمجھے ہیں

ہر اک انقلاب میں مہرباں مری برہمی وہ بجلیاں
کوئی انقلاب رخ جہاں نہ بدل سکا نہ بدل سکے

علماء، اہل تصوف اور دنیا کے دعویداروں کی دو عملی
کو اس طرح آشکارا کرتے ہیں

اسیر جلوہ کسی کو ہے خاصان جہاں سے
یاراں طریقت کا ہے قول و عمل اور

آج ہندوستان اپنی تاریخ کے خطرناک ترین بحران سے
گذر رہا ہے جو لیڈر اپنی پگڑیوں کی طرح تبدیل کیا جا رہا
ہیں

کس پہ عمل ہو کس پہ یقین
روز بدل جاتا ہے نظام

ملت اسلامیہ ہند کے لئے خصوصاً اور ملت اسلامیہ عالم
کے لئے عموماً یہ اشعار کس قدر مبنی بر حقیقت ہیں اور ان کا
حلقہ مراد آباد سے کر الجیریا بیروت اور الجیریا آسام تک
وسیع ہے۔

ہنگامہ تخریب چمن میرے لئے ہے
بے مہری ارباب وطن میرے لئے ہے
میں رہبر کے ارباب کو سجدہ نہیں کرتا
پیشانی دوراں پہ شکن میرے لئے ہے

عہد حاضر میں زندگی ہر لحظہ تغیر پذیر ہے، آج کی حقیقت
کل کا افسانہ ہے اور کل کی حقیقت آج کی کہانی۔ کسی بھی نظریے
کو خواہ وہ سیاسی ہو یا اقتصادی، سماجی ہو یا خالص علمی
و سائنسی کسی طور قرار نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قدریں
بھی بدلتی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی ہمیشہ
سے غیر جامد چیز رہی ہے اور اسی کو بزرگوں نے دھوپ
چھاؤں سے تعبیر کیا ہے شاد ان سب پر اپنے احساس کا

اظہار یوں کرتے ہیں

زندگانی ہے بدلتے ہوئے حالات کا نام
کبھی نالاں کبھی گریاں کبھی خنداں ہونا

اور اللہ رے عہد نو کا یہ دور کا مذاق

لیتی ہے ہچکیاں سی رہ رہ کے زندگانی

اور شروع میں نظر آتے ہیں ہم سفر کتنے
پھر اس کے بعد ہر ایک ساتھ چھوڑ جاتا ہے

یا تکلفات کی بھرمار ہے دوستی میں
محبت کا نقشہ بدلنے لگا ہے

جدید و قدیم تہذیب دو متصادم دھاروں کا نام ہے جو کبھی باہم دگر مل کر ایک نہیں ہو سکتے اور اگرچہ تہذیب نو تمام ہتھیاروں سے لیس ہے مگر بقول شاد

تہذیب نو کتنے ہی انداز دکھائے
وہ طرز روایات کہیں چھوڑ سکے گی

فن سے نابلد لوگوں کی قدر افزائی اور اہل فن کی رسوائی کی تصویر ملاحظہ ہو

بڑا بلند ہوئے ہیں جہلِ مکتب
ادب کا نام اچھالا جا رہا ہے

شاد صاحب غزل کے شاعر ہیں اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک باوفا مرید اور ایک باصفا مرشد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اسی لئے ان کے کلام میں بہت بلند آہنگ لیے ہوئے تصوف معرفت حق اور حق پرستی کی دعوت اس کی حکمتیں اور فوائد جگہ جگہ موجود ہیں۔ وہ ایک سچے مومن کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ پتہ بھی خدا کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا

وہ سرور زندگی ہو کہ خمار جام ساقی
ہے فقط نام بزم عالم ترے اہتمام تک ہے

اگر عبادت میں خلوص نہ ہو تو نماز میں بے کیفی،

روزے بوجھ اور زکوٰۃ تاوان نظر آتی ہے اور اس حال میں اگر کوئی شخص مجبوراً ان فرائض کو ادا کرتا ہے تو اسے کوئی نفع نہیں ہوتا اور آخر کار وہ سب کو چھوڑ چھاڑ ا تو جھاڑ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسی لئے اخلاص کو حدیث نبوی میں عین ایمان قرار دیا گیا ہے اور عدم اخلاص کو نفاق بتایا گیا ہے۔ شاد اس کی ترجمانی یوں کرتے ہیں

بندگی وہ کیا شرط ہو جس میں خلوص
پہلے دل جھکتے ہیں پھر پیشانیاں

وہ سوال کرتے ہیں

وہ سجدہ اصل میں ہے جو معیار بندگی
میری جبیں میں ہے کہ ترے سنگ در میں ہے

ظاہر باطن کا آئینہ ہے اگر کسی کا باطن تاریک ہے تو ظاہر کیسے روشن رہ سکتا ہے

کیا آب ہو چہرے پہ جب دل ہی نہیں روشن
چہرے پہ ۔۔۔ ہے تو دل کو نکھرنے دے

شاد جیسا کہ میں نے کئی بار کہا ہے ایک ماہر فن اور قادر الکلام شاعر ہیں اور انہوں نے غزل کے علاوہ رباعی قطعہ اور نظم کے میدان میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی ہے اور یہاں بھی انہوں نے تہذیب نو کے ان متعفن اور رستے ہوئے ناسوروں کی نشاندہی کی ہے جو نوع انسان کی بقا کے لئے حقیقی خطرہ ہیں اور تہذیب کے اقدار کے طور طریقوں اور محبت اور دوستی کے نئے معیاروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ دیتے ہیں

وہ کہتے ہیں

دل سے دل لٹے جاتے ہیں یہاں ایمان خریدے جاتے ہیں
زرداروں کی دنیا ہے یہ انسان خریدے جاتے ہیں
قربت ہے نہیں اب دولت سے ہوتا ہے محبت کا سودا
اس اور بہ عصمت بکتی ہے ایمان خریدے جاتے ہیں

یا

دامن خاک چھاننے والے
دہر کی تو بہت ہی گندی ہے
بے طلب ہو کے گر نصیب ہو چیز
بے نیازی کی نیازمندی ہے

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے تو "شاعر"، "پاسبان حرم"، "شب معراج"، "ہم لوگ" ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ خاص طور سے پاسبان حرم میں علامہ اقبال کا رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے۔ ایمان کی قوت اور اس کی قیمت اس کے قدر دانوں کو ہی معلوم ہے۔ شاد ایک ایمان پسند اور ایمان پرست شاعر ہیں وہ کہتے ہیں

دہر میں ایمان سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں
اور اس سے بڑھ کے دنیا میں کوئی دولت نہیں

کہیں کہیں شاد بہت بلند ہے اور وہ ہم ایمان کو ان کی حقیقت سے بڑے ہی واضح انداز میں باخبر کر دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

شاد بھی مسلمانوں کو خطاب کرتے ہیں

آج بھی تیری زباں خالی نہیں تاثیر سے
دل دہل جاتے ہیں اب بھی نعرۂ تکبیر سے
مرد مومن کو کب میسر ہے ترا انداز مگر
وسعت کون و مکاں تک ہے تری پرواز مگر

مسلمانوں کا سارا فخر، ساری بڑائی، ساری عزت سارا شرف آج حرم کی غلامی میں ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

شاد بھی اپنے انداز فکر میں کہتے ہیں

ہر ادا تیری خدا کو اس لئے منظور ہے
محبت تو اللہ کے محبوب کا محبوب ہے

یہ اور اس جیسے اشعار شاد صاحب کی نیک طینتی اور اسلام دوستی پر خلوص محبت کا ثبوت ہیں۔

شاد کا کلام پہلو دار اور تہہ دار ہے اور اس کی مکمل توضیح کے لیے یہ صفحات تنگ ثابت ہو رہے ہیں اگر مجھے موقع ملا تو پھر کبھی تفصیل سے لکھوں گا۔ فی الحال میں فاضل دیباچہ نگار جناب شمس بدایونی کے اس تجزیہ کو دہراتے ہوئے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں وہ دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"ان کے کلام میں اصغر کا کیف و نشاط، درد کا تصوف کا رنگ اور فانی کا سا تغزل جھلکتا ہے۔ زبان کی حلاوت اور بیان کی لطافت داغ اسکول کا عطیہ ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے قاری کو کلام شاد کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے تاکہ وہ ماضی کے تجربات اور حال کے حوادث سے آگاہ ہو کر مستقبل کی بصیرت و بصارت پا سکے اور اپنے لئے اور اپنی ملت کے لئے حیات نو کا پیامبر بن سکے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں (اقبال)

فضل رب اصلاحی

وہ فاقہ مست کہ...

روس کی توسیع پسندی اور اپنے ہمسایہ ممالک پر جارحیت کا سلسلہ اس کے انقلاب کے تھوڑے دنوں بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ ترکستان، ازبکستان، قازقستان، تاجکستان، ترکمانیہ اور وسط ایشیا سے یورپ تک پھیلے ہوئے ممالک غیر روسی ہیں۔ جنھیں روس کی توسیع پسندانہ ذہنیت نے زبردستی اپنی نوآبادیات میں داخل کر لیا ہے۔ آج روس کی سرحدیں ۸۰ لاکھ مربع میل پر مشتمل ہیں۔ جبکہ رقبہ صرف ۵۰۰ مربع میل تھا۔ ابھی بار افغانستان کو اس نے اپنی توسیع پسندانہ ذہنیت کا ہدف بنایا ہے۔ خدانخواستہ اگر روس افغانستان میں اپنے مستحکم پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ پورا جنوب مشرق اور خلیج کی تمام ریاستیں اس کی زد میں ہیں۔

آج سے تین سال قبل جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تھا تو اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ افغان قوم اس سے برسرپیکار ہونے کی جرأت کرے گی۔ یقیناً اگر روس کو ان حالات کا تجربہ/اندازہ ہوتا تو وہ اس بیوقوفی کے کرنے کی ہرگز جرأت نہ کرتا۔ اس نے سوچا تھا کہ جس طرح ہنگری، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ میں وہ دندناتا ہوا گھس گیا تھا اور بلا کسی ادنیٰ مزاحمت کے وہاں حکومت سنبھال لی تھی۔ اسی طرح سے افغانستان کو بھی آسانی سے نگل جائے گا۔ مگر اس کے تمام تصورات کے برعکس افغانستان اس کے گلے کی ہڈی بن گیا۔ جسے نگلنا تو درکنار اگلنا بھی اس کے لئے دشوار تر ہو گیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ افغان قوم غلامی کا قلادہ کبھی اپنی گردن میں نہیں ڈال سکی ہے۔ اور نہ کبھی کسی غیر افغان قوم نے افغانستان پر حکومت کی ہے۔ آزادی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ جب کسی زمانہ میں برطانیہ جس کی سلطنت میں کبھی سورج نہیں غروب ہوتا تھا۔ باوجود کوشش کے افغانستان پر اپنا قبضہ نہ جما سکی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ حملہ بھی کیا مگر ہر مرتبہ ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شجاعت اور بہادری افغانستان کے لوگوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ صحرائے گوبی اور سائبیریا کے وحشی انسانوں نے کسی زمانہ میں آندھی اور طوفان بن کر اٹھے اور ساری اسلامی دنیا کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔ لیکن جب اسلام کی حقانیت ان پر ظاہر ہو گئی۔ تو یہی لوگ کعبہ کے نگہبان بھی بن گئے۔ درۂ خیبر کے سنگلاخ اور دشوار گذار راستے آج تک ان کی بہادری اور شجاعت کی خاموش داستان سنا رہے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افغانستان روس کے لئے ویت نام ثابت ہوگا۔ حالانکہ ویت نام اور افغانستان میں بہت

فرق ہے۔ ویت نام کو روس، چین اور دوسرے کمیونسٹ ممالک سے بے پناہ امداد ملتی تھی۔ چین میں اسلحہ فوجی سامان اور خوراک تک آسانی پہنچ سکتی تھی، بلکہ ... کے قریب پورا شمالی ویت نام موجود تھا۔ دوسرے امریکی فوج اپنے ملک سے دور بہت دور لڑ رہی تھی۔ انھیں اپنی سرزمین سے مخالف آب و ہوا کا سامنا تھا۔ ویت نام کی دلدلی زمین اور پانی کی فراوانی کے ساتھ گرم مرطوب ہوا۔ جہاں رنگ سے زیادہ غیر مانوس تھی ... جبکہ ویت نام کے عوام ایک منظم ... کے تحت لڑ رہے تھے۔

افغان مجاہدین کے ساتھ معاملات بالکل برعکس ہیں۔ پچھلے تین سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی کسی ذریعے سے فوجی سامان اور اسلحہ کی امداد کی خبر باوثوق ذرائع سے نہیں مل سکی ہے۔ اقوام متحدہ اور چند دوسرے ممالک کی طرف سے ان مہاجرین کو جو تین سال سے کیمپوں کی زندگی گزار رہے ہیں، ایک قلیل رقم پیش کی گئی ہے۔ جو ان کی تعداد کی کثرت کے لحاظ سے اونٹ کے منہ میں زیرے کے مصداق ہے۔ دوسرے ان کا مقابلہ ایک اجنبی قوم سے ہے۔ جس کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں۔ موسم کی تبدیلی روسیوں کیلئے کوئی مشکل پیش نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ اس سے بھی زیادہ سنگلاخ اور سرد موسم کے پروردہ ہیں۔ تیسرے افغانستان مجاہدین متفرق طور الگ الگ گروہوں میں لڑ رہے ہیں۔ جنکا آپس میں بہت کم رابطہ رہتا ہے۔

پھر...... آخر کس طاقت کے سہارے ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ حق و باطل کی اس جنگ میں افغانستان کو فتح ہوگی اور روس کو افغانستان چھوڑ کر واپس جانا ہوگا!...... جبکہ روس دنیا کی دوسری سپر پاور طاقت ہے۔ جو دنیا کے جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہے اسکے برخلاف افغان بے سروسامان و جدید جنگی تکنیک سے بے بہرہ ہیں۔ روس اور افغانستان کا مقابلہ ہاتھی اور ... سے ... کا ہے۔

لیکن...... ان افغان قوم کے پاس ایک ایسا اسلحہ ہے جو دنیا کا ترقی یافتہ ترین ایٹم بم کو بھی خاطر میں نہیں لا سکتا ہے۔ یہ وہی اسلحہ ہے جس نے کبھی عرب جو بہادری، شجاعت، فاقہ کشی اور خانہ جنگی ... ان صحرائی ... کے ... شاید سمجھے ... اس دوران جو اپنے زمانے کی سپر پاور طاقتیں تھیں ... اور دیکھتے ہی دیکھتے نصف دنیا پر چھا گئے۔ وہ اسلحہ "ایمان" ہے "شوق شہادت" ہے، یہ عقیدہ ہے کہ موت جنت کا دروازہ ہے۔ اور خدا سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ ... موت کا ایک دن معین ہے۔ اس سے ایک سیکنڈ پہلے دنیا کی کوئی طاقت کوئی اسلحہ اسکا بال بیکا نہیں کر سکتا ہے۔ یہ وہ ... جو اگر کسی ... کے دل و دماغ پر چھا جائیں اور خون و روح بن کر ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائیں، تو ماہرین ... ان کے عزم و شجاعت اور قوت بازو کا اندازہ لگانے سے قاصر رہ جاتے ہیں، اور پھر ان ... سے خوارق عادات کا ظہور ہوتا ہے۔

ان افغان مجاہدین کے پاس ایمان اور شوق شہادت کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے۔ مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات ... ہیں۔ اور اب تو روسی درندوں نے انھیں بھی ... کر دیا ہے، تین سال سے افغانستان کی بیشتر آبادی پہاڑوں کے کھوہوں یا پڑوسی ممالک میں خیمے کی زندگی گزار رہی ہے۔ روٹی کا ٹکڑا، انگور کے دانے، خربوزہ یا تربوز کی پھانک سے کھانا ان کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے ... کے ساتھ ... مل جائے تو غنیمت ہے ... کیلئے اگر قہوہ میسر آجائے تو کیا کہنا ... افلاس کی اس فراوانی کے باوجود جب تک ان افغانیوں کے اندر ایمان کی رمق باقی ہے اس وقت تک افغانستان ... روس کو چین نصیب نہیں ہو سکتا ہے، یہ ممکن ہے کہ افغانستان کی سرزمین پر روس کا قبضہ ہو جائے مگر افغان

(بقیہ صفحہ ... پر)

جسٹس سید غوث علی شاہ
وزیر تعلیم، ثقافت اور ثقافتی امور سندھ

اقبال اور فلسفۂ تعلیم

خطبۂ الٰہ آباد قومی وقار کی دستاویز ہے

علامہ اقبال نے الہ آباد کے مقام پر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبہ دیا تھا وہ ہماری ملی تاریخ کی ایک اہم دستاویز بن گیا ہے۔ وہ خطبہ بہ حیثیت مجموعی بڑا فکر انگیز ہے۔ اس سے پیشتر ملی منزل کے تعین کی راہ ہموار ہوئی اور ہمارے ملی تشخص کی وضاحت ہوئی۔ اس خطبے کی ابتدا میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ:

"میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اس کی سماجی تشکیل، اس کے نظام قانون اور اس کی تاریخ، تمدن اور ادب کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کی اس حقیقی روح سے ایک مسلسل رابطہ کی وجہ سے مجھ میں وہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ اسلام کو ایک آفاقی حقیقت کے تناظر میں دیکھ سکوں۔"

علامہ اقبال نے واقعی اسلام کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کے جذبۂ ایمانی نے اس مطالعے کو ان کی فکر و فن کے لئے روشنی کا وسیلہ بنایا اور انھوں نے دورِ حاضر کے فکری اور علمی تقاضوں کے پیش نظر ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے اسلام کی حقیقت سمجھی اور سمجھائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار میں وہ تمام اجزائے ترکیبی موجود ہیں جن پر ایک نظام تعلیم کی بنیاد استوار ہو سکتی ہے اور جسے ہم "فلسفۂ تعلیم" کہتے ہیں۔

اگر ہم غور کریں تو ہمیں اس پوری کائنات میں بھی ایک مکمل، واضح اور ہمہ گیر نظام موجود و منظم نظر آئے گا کیونکہ اس کا خالق علیم و خبیر بھی ہے۔

"وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں۔ اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند کیا۔" (سورہ رعد، آیت ۲)

"سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور اسی اللہ نے رات کو سکون کا وقت بنایا اور اسی نے سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا۔" (سورہ رحمٰن، آیت ۵)

"نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔" (یٰسین ۴۰)

"اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔" (النحل ۶۸)

قرآن پاک کی آیات کے ان چند حوالوں سے اس نظام تعلیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس کائنات میں ہر شے کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اور ہر شے اس علم کے مطابق ہی کائنات کے نظم کو برقرار رکھ کر عمل کر رہی ہے۔ یہ علم پوری کائنات کے لئے ہے اور کائنات کے وارثین یعنی انسان کے لئے بھی خاص ہے۔ لیکن انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک استثنا رکھا ہے۔ کائنات کی ہر شے کا علم اللہ تعالیٰ براہ راست بخشتا ہے لیکن انسان کو حصول

علم کی صلاحیت ودیعت فرما کر اللہ تعالیٰ نے براہ راست ہدایت
سے اسے مستثنیٰ کر دیا ہے لیکن انسانوں کو حقیقی علم کی روشنی مہیا کرنے
کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان اپنے رسولوں اور نبیوں
کو بھیجا۔ انسانوں کے لئے اللہ کی ہدایت مکمل ہادیٔ برحق
پر ہو گئی۔

انسان ارادے اور اختیار کی قوت رکھتا ہے اور اس قوت
کا ایک دائرہ عمل ہے۔ اسی بنا پر انسان کے لئے حق و باطل اور
خیر و شر کے درمیان فرق کرنے کا مرحلہ آیا۔ اس فرق کے فیصلے کا
انحصار خود انسان پر ہے۔ وہ اللہ کی عطا کردہ علم کی روشنی
سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یا اس روشنی کی جانب سے آنکھیں بند
کر کے اور خود تجربات کے اندھیروں سے گزر کر نتیجوں کے
چراغ جلا کر دھیمی روشنی میں آہستہ آہستہ زندگی کی راہ پر
قدم بقدم آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس دوسری راہ پر خسارہ یقینی ہے
لیکن روشنی کی جانب سے آنکھیں بند کر لینے کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ
ہو بھی نہیں سکتا۔ انسان تجربات کی طویل مدت کے نقصانات سے
صرف اسی صورت میں محفوظ ہو سکتا ہے جب قدرت کے نظام تعلیم
اور انسان کے فلسفۂ تعلیم میں پوری ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ یہ ہم
آہنگی پیدا کرنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے
سننے، سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیتوں کے ساتھ اسے
زندگی کی راہوں کے لئے مکمل اور واضح ہدایات کی روشنی بھی عطا
کر دی ہے۔

اس پس منظر میں اقبال اور فلسفۂ تعلیم پر گفتگو کرتے
ہوئے مناسب ہے کہ ہم اقبال کے خیالات کے حوالوں سے اس کی
ابتدا کریں۔ خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں اقبال نے
لکھا تھا:

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام
طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم
سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے تحت رہنا چاہئے۔
اگر دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم حق کی ابتدا
ہے۔ وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم حق کی آخری منزل
ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ اس علم
کو جس کا دار و مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی
ہے مسلمان کرے۔ اگر علم کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع
انسانی کے لئے سراسر رحمت ہے۔"

اقبال کے یہ خیالات ان کے فلسفۂ تعلیم کی پوری وضاحت
کر دیتے ہیں۔ یہی خیالات ان کی شاعری میں اپنی پوری فنی اعلا قوت
اور یقین کی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ انہوں نے کہا ہے:

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

انسان کے لئے فلسفۂ تعلیم کا مقصد یہی ہونا چاہئے کہ عقل و
خرد کی پاکیزگی حاصل ہو جائے۔ یہی شرف انسانیت کا ثبوت ہے۔
اسی کے وسیلے سے انسان کائنات پر اعتماد اور خودشناسی کی بلندیوں
سے نگاہ ڈالتا ہے۔ اس کے بغیر انسان احساس محرومی کا شکار ہو جاتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال انسانی زندگی میں ایمان کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں
کیونکہ ایمان ہی سے زندگی کے بارے میں انسان کا زاویۂ
نگاہ متعین ہوتا ہے۔ اصلاً اللہ پر ایمان علم و عمل میں ڈھل کر
درحقیقت خود انسانیت کے شرف اور تکریم پر ایمان بن جاتا
ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی فلسفۂ تعلیم میں یہی بنیادی فرق
ہے۔ اہل مغرب اپنے ذرائع ابلاغ سے انسانی حقوق کے
جتنے اعلانات چاہیں کریں اور وہ بلاشبہ اس راہ میں بڑی بھاگ
دوڑ اور بڑے تجربات کر رہے ہیں لیکن ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ
توحید پر ایمان سے محرومی کی بنا پر اس بنیاد سے محروم ہیں

جس پر احترامِ آدمیت کا تصور قائم ہوتا ہے۔ مغربی فلسفۂ حیات نے بہرحال انسان کو "سماجی حیوان" یعنی SOCIAL ANIMAL قرار دیا ہے اور ان کے نظامِ تعلیم کی بنیاد اسی تصور پر استوار ہوتی ہے۔ زمانۂ حاضر کا انسان ایمان کی اس توانائی سے محروم ہے جو عقل کی رہنمائی کرتی ہے اور اسی وجہ سے بقول اقبال ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں سارا عالمِ انسانیت ایک شدید المیے سے دوچار ہے۔ یہ المیہ اہلِ مغرب کو بھی درپیش ہے اور اہلِ مشرق کو بھی۔ یعنی یہ المیہ ان کے سامنے بھی ہے جن کو ہم مذہب سے بیگانہ سمجھتے ہیں اور خود ہمارے سامنے بھی ہے۔ حالانکہ ہم اپنے دعوؤں کے مطابق اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اقبال نے اس حقیقت کا تجزیہ یہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ؎

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

اقبال کے افکار کی خوبی یہ ہے کہ وہ حقائق کا تجزیہ کرتے ہیں، انسانی الجھنوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس پر عمل کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن بات یہیں ختم نہیں کرتے بلکہ اپنے ایمان کی روشنی میں انسان کے بنیادی مسائل کا حقیقی حل بھی پیش کرتے ہیں۔ اقبال کا خیال یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کی رہنمائی اور فلاح کی سب سے بڑی ذمہ داری تو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے اور مسلمانوں کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنی ملی اہمیت اور ذمہ داریوں سے بے خبر اہلِ مغرب کی اندھی تقلید کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور یہ صورتحال اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ مسلمانوں نے مغرب کا نظامِ تعلیم معہ ان کے فلسفۂ تعلیم کے قبول کر لیا ہے۔ گویا ملی کا یہ دیرینہ مرض جو مسلمانوں کو لاحق ہو گیا ہے اس کی حقیقی وجہ اقبال کی نگاہ میں ہماری اجتماعی زندگی پر مغرب کے نظامِ تعلیم کی مکمل گرفت ہے۔ "دین و تعلیم" کے عنوان سے انہوں نے کہا ہے ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اس اعتبار سے نجات کا تعین اگر کیا جائے تو ہماری اولین اس کوشش کو ہونی چاہیے کہ ہم مغربی تعلیم کے فلسفے اور نظام کی گرفت سے آزاد ہوں۔ اس آزادی کے بغیر بہ حیثیت مسلمان ہماری اجتماعی زندگی کی حقیقی تعلیم و ترقی کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ حقیقت اپنے ذہنوں میں واضح رکھنی چاہیے کہ علم اور تعلیم کا فلسفہ اور نظام ایک ہی تصویر کے دو رخ جیسے نہیں ہیں۔ علم الگ حقیقت ہے اور اس کا فلسفہ اور نظام الگ ہے۔ علم عالمگیر ہے اور ساری انسانیت کی یکساں میراث ہے جبکہ تعلیم کا فلسفہ اور نظام کسی بھی قوم یا کسی بھی انسانی گروہ کے نظریۂ زندگی سے منسلک ہوتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے

یہ کہ ہمیں مغرب کے فلسفۂ تعلیم سے آزادی حاصل کر لینی چاہیے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمیں مغرب کی علمی، فنی اور تکنیکی ترقیوں سے منہ موڑ لینا چاہیے۔ علمی ارتقا میں ساری انسانیت کا حصہ ہوتا ہے اور تمام انسان اس سے یکساں انداز میں استفادہ کر سکتے ہیں۔ علم بانٹا نہیں جاتا، حاصل کیا جاتا ہے اور علم انسانیت کے لئے باعث ضرر نہیں ہوتا۔ علم کا غلط استعمال ایسے انسانوں کے نقصان کا باعث بنتا ہے اور اس کے استعمال کا تعلق نظریۂ زندگی سے ہوتا ہے۔ مغرب کا علم انسانیت کے لئے عذاب کا باعث اس لئے بن رہا ہے کہ مغرب کا تصور زندگی اس کا فلسفۂ حیات درست نہیں ہے۔

مغرب کے نظریۂ حیات کی اسی بنیادی خامی کی طرف اقبال نے بار بار اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
وہ فرنگی مدنیت کہ جو خود ہے لبِ گور

یہی وجہ ہے کہ اقبال ہمیں مغرب کے نظریۂ زندگی کی خامیوں سے آگاہ کر کے ہمیں اس سے دور رہنے کی مسلسل تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اس نظریۂ زندگی کے نعم البدل کے طور پر وہ اسلام کی علمی اور فکری تشریح کرنا چاہتے ہیں کہ ہم زندگی سے اسلام کے جن اصولوں کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں علم اور عمل کے ذریعے سے حقیقی معنوں میں اپنا لیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فلسفۂ تعلیم کی سمت درست کرنی ہوگی اور اقبال اس راہ کے ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اقبال انسانی زندگی کا محور و مرکز ایمان قرار دیتے ہیں۔

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری ؎
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

یہی تصور ہمارے فلسفۂ تعلیم کا محور و مرکز بھی ہے۔ اس کے بعد تعلیم کے حصول اور تعلیم کی ترویج کے بارے میں انسان کا زاویۂ نظر بھی بدل جاتا ہے۔ مغرب کا فلسفۂ تعلیم زر کو بالآخر مالی منفعت اور ذاتی آسائشیں حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اقبال کے خیال میں محض حصولِ زر کا مقصد ہی تمام خرابیوں کی بنیاد ہے ؎

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

ہمارے ایمان کی بنیاد پر ہمارے فلسفۂ تعلیم کا اصل مقصد ہماری زندگی میں احترامِ آدمیت کے تصور کو ایک قوتِ متحرکہ کی حیثیت سے قائم کرنا ہے یعنی اجتماعی زندگی سے ہر قسم کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی ناہمواریاں ختم کر کے انسان کو انسان کے اقتدار سے آزاد کرانا ہے۔

آدمیت احترامِ آدمی   باخبر شو از مقامِ آدمی

اگر توحید پر ایمان کے وسیلے ہماری نگاہوں میں احترامِ آدمیت کا تصور باقی نہ رہے تو پھر انسانوں کا ایک گروہ انسانوں کے دوسرے گروہ کے استحصال کی ہزار صورتیں نکال لیتا ہے اور اس پر ہزار جواز پیدا کر سکتا ہے۔

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

اس اعتبار سے فلسفۂ تعلیم کا اصل مقصد انسان کی کردار سازی قرار پاتا ہے یعنی ہم یہ سمجھ سکیں کہ اچھا آدمی بننے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ سماجی زندگی کی اس حقیقت کا علم اور اس کے مطابق عمل انسان کی ذات میں وہ استحکام پیدا

کرتا ہے جس کا حاصل کرنا ہر انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد ہے۔ اس مقصد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک ہی میں اس نظام کائنات کی تخلیق کا مقصد بھی یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے بہتر اعمال کے نتیجے سامنے آ جائیں۔ سورہ ہود میں ارشاد ہوا ہے۔

" اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا۔ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے" (ہود ۷)

اور یہی حقیقت سورہ ملک میں یوں واضح کی گئی ہے

" نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے" (آیت ۱-۲)

اقبال کے فکر و فن کی عظمت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن حکیم اور سیرت طیبہ سے روشنی حاصل ہوئی ہے۔ ان کے افکار اسی روشنی سے منور ہیں اور ان کا تصور خودی بھی اسی روشنی کا مظہر ہے:۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اس تصور پر ایمان کی وجہ سے ہمارا فلسفۂ تعلیم بھی اسی اصول پر استوار ہوگا کہ انسانی زندگی کا مقصد انسانی ذات کا استحکام ہے اور یہ استحکام اقبال کی اصطلاحات میں اسرار خودی اور رموز بے خودی کی یکجائی سے پیدا ہوتا ہے۔ اقبال دونوں پہلوؤں پر یکساں زور دیتے ہیں کیونکہ انہیں اسرار و رموز کے اپنے ہم آہنگی پر انسان کی معاشرتی زندگی کی فلاح اور اس کی ارتقا کا انحصار ہے۔

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از فرد می یابد نظام

اسی بات کا اظہار اقبال نے ان اشعار میں بھی کیا ہے:۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ:۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

یعنی فرد اور ملت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کا مقصد باہمی طور پر ایک دوسرے کی فلاح کی کوشش ہے۔ فرد جماعت کی فلاح کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح جماعت یا ملت مستحکم ہو کر خود اس فرد کی فلاح اور اس کے تحفظ کی ضمانت بن جاتی ہے۔ اصل میں افراد کی بنیادی انفرادی تعمیری صلاحیتیں کسی اجتماعی نظام کے بغیر بروئے کار نہیں آ سکتیں کیونکہ انسانوں کا انسانوں سے واسطہ جب پڑتا ہے اسی وقت انسان کو اپنی خامیوں کا اندازہ کرنے اور ان پر قابو پانے کے مواقع ملتے ہیں۔ اپنی خامیوں پر قابو پانا اور خوبیوں کو مسلسل بیدار رکھنا جہد مسلسل کی سب سے اچھی صورت ہے اور جہد مسلسل ہی حقیقی زندگی کی علامت ہے:۔

ہے آب حیات اسی جہاں میں
شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی

انسانی زندگی کا مقصد در اصل اتنا عظیم ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے اس مقصد سے قریب تر ہونے کے لئے انسان ساری زندگی اس کوشش میں بسر کر سکتا ہے لیکن اس کا مکمل حصول ممکن نہیں۔ بات یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں

اور خود انسان کی ذات کے اندر خیر و شر کے درمیان ایک مسلسل آویزش جاری رہتی ہے۔ یہی آویزش انسان کے لئے آزمائش ہے۔ اسی آزمائش سے کامیاب گزرنا انسان کے لئے سرخروئی کا باعث ہے۔ نہ تو خیر و شر کے درمیان یہ آویزش کبھی ختم ہوگی اور نہ انسان کے لئے آزمائش کے مراحل کبھی اختتام کو پہنچیں گے۔ ہمارا اپنا فلسفۂ تعلیم یا وہ فلسفۂ تعلیم جو اقبال کے فکر و فن میں نظر آتا ہے اس راہ پر ہمیشہ خیر اختیار کرنے اور شر سے بچے رہنے میں معاونت کرتا ہے کیونکہ ہمارے ایمان کے مطابق جو ہمارے فلسفۂ تعلیم کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے خیر و شر کی یہ آویزش قانون قدرت ہے اور یہ بھی نظام قدرت ہے کہ خیر باقی رہے گا اور شر ختم ہو جائے گا۔ انسان کے لئے اس میں رمز پوشیدہ یہ ہے کہ وہ اس آزمائش کی راہ سے گزرے گا تو مظاہر کائنات اور قانون قدرت کی اعانت اسے حاصل ہوگی اور یہ کہ زندگی کی راہ پر آزمائش کا یہ سفر خود اس کی ذات کے استحکام کا باعث ہوگا۔ یہی حقیقت ہے جس کی تشریح اقبال نے اس انداز میں کی ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

اس مرحلے پر اس سچائی کا اظہار ناگزیر ہے کہ مغرب کی علمی، فنی اور تکنیکی ترقی نے ہماری نگاہوں کو الوہی ہدایت کے حقیقی نور سے محرومی کے باعث خیرہ کر دیا ہے ورنہ اپنے تمام کمالات علمی کے باوجود مغرب اب تک انسان کی حقیقی عظمت کے ادراک سے محروم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی علمی اور عملی ترقیاں انسانیت کو خود اعتمادی کے بجائے خوف اور بے بسی میں زیادہ مبتلا کر رہی ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے وسیلے سے عالم انسانیت کو علم کی جو روشنی حاصل ہوئی وہ انسان کے لئے ترقی کا باعث تو ہوئی لیکن اس علم کی وجہ سے انسان کو خوف بے بسی اور بے چارگی کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے فلسفۂ تعلیم کے تحت انسان کے لئے علم کے ساتھ ساتھ عقل و خرد کی پاکیزگی حاصل کرنا بھی ضروری ہے اور یہ پاکیزگی علم کو انسان کے لئے خیر کا باعث بناتی ہے اور شر کا باعث بننے سے روکتی ہے۔

اقبال کو ہم ان کے تصور خودی کے حوالے سے پہچانتے ہیں اس لئے اقبال اور فلسفۂ تعلیم کے سلسلے میں اس تصور کی مختصر تشریح بھی ضروری ہے۔ اقبال نے یہ اصطلاح انسان کی ذات کے لئے استعمال کی ہے اور اپنے داخلی امکانات کی وجہ سے انہوں نے انسانی ذات کو ایک بیج سے تشبیہ دی ہے جو مٹی میں دب جانے کے بعد ایک درخت کی صورت فضا میں پھیل کر اپنے وجود میں موجود امکانات کی نشو و نما کر لیتا ہے۔ اس کیفیت سے اقبال نے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "تسلیم و رضا" کا اصل مقصد اشیاء کے وجود میں امکانات کا تعمیری اظہار ہے۔ انہوں نے کہا ہے ؎

ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند
مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا

اس اعتبار سے ہمارے فلسفۂ تعلیم کا اصل مقصد انسان کی تخلیقی صلاحیتیں اس انداز میں بیدار کرنا ہے کہ معاشی زندگی میں اس کے تعمیری نتائج برآمد ہوں۔ یعنی ہر فرد معاشرتی زندگی کی فلاح کی کوششوں میں مصروف رہے اور خود بھی اسی معاشرے کا فرد ہونے کی بنا پر اس کی یہ کوششیں بالواسطہ خود اس کی اپنی فلاح کی ضمانت بھی فراہم کرتی چلی جائیں گی۔ اسی صورت سے ہر انسان قدرت کی منشاء اور مرضی کے مطابق اپنے وجود کا مکمل مظہر بنتا ہے اور قدرت کی منشاء کے مطابق عمل پیرا ہو کر خیر کا باعث بنتا ہے۔ اقبال اور فلسفۂ تعلیم کے سلسلے میں اسی زاویہ نظر کا

کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو علم کے حوالے سے انہوں نے ختم نبوت کی حقیقت کے بارے میں پیش کیا ہے اپنے خطبات میں اسلامی ثقافت کی روح کے عنوان سے اقبال نے کہا ہے۔

"اسلام میں نبوت اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی اس لئے اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اپنے وسائل سے کام لینا سیکھ لے۔ اسلام نے جو پیشوائیت کو تسلیم نہیں کیا، موروثی بادشاہت کو جائز قرار نہیں دیا، بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، اور عالم فطرت اور تاریخ کو انسانی علوم کا سرچشمہ قرار دیا اور اگر ہم غور کریں تو اندازہ ہو جائے گا کہ ان تمام باتوں میں نبوت کی خاتمیت ہی کا کوئی نہ کوئی پہلو پوشیدہ ہے۔"

ختم نبوت کے تصور کے بارے میں اقبال کا یہ زاویہ نگاہ بڑا فکر انگیز ہے اور اس عقیدہ کی بنیاد ہمارے فلسفۂ تعلیم کو لامحدود وسعتیں عطا کر دیتی ہے۔ ختم نبوت کا تصور محض ایک روایتی عقیدہ نہیں زندگی کا ایک مکمل رویہ ہے اور علم و عمل کی دنیا میں یہ عقیدہ بہ حیثیت مجموعی انسانیت کے باشعور ہونے کا اعلان ہے اور اس کے وسیلے سے حیات و کائنات کے مسائل میں تحقیق، تجسس، دریافت، انکشاف اور جہد مسلسل کے بے شمار امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

اقبال دور حاضر میں اسلامی فکر کے بڑے معتبر مفسر ہیں۔ ان کی حکمت و فن کے حوالے سے ہم فلسفۂ تعلیم کا جو خاکہ بھی تیار کریں گے وہ خود بخود اسلامی فلسفۂ تعلیم کا خاکہ بن جائیگا۔ ہر ملک اور ہر قوم کے لئے فلسفۂ تعلیم ایک زندہ مسئلہ ہے زندہ مسئلہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس فلسفۂ تعلیم میں زندگی کی حقیقتوں، اس کے تغیرات اور مراحل ارتقا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت ہے جہاں تک مغرب کے فلسفہ تعلیم کا سوال ہے تو ان کے سامنے زندگی کی بنیادی اور مستقل قدروں کے تحفظ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے عملی اعتبار سے ان کے فلسفۂ تعلیم کا تعلق صرف مادی زندگی سے ہے اس لئے وہ مستقل اخلاقی قدروں کے تعین اور ان کے تحفظ سے کوئی فکری یا ذہنی رشتہ نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس مستقل اقدار حیات ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدریں زندگی کے ارتقائی مراحل میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس وہ قدریں انسانی زندگی کو حقیقی ارتقائی راہوں سے گزرنے کے قابل بنانے میں نہ صرف معاونت کرتی ہیں بلکہ اس بات کی ضمانت بن جاتی ہیں کہ زندگی ان ہی قدروں کی توانائی سے سرخرو اور کامیاب ہو گی۔ انسان اس دنیا میں صرف امکانات کا مجموعہ بن کر آتا ہے۔ وہ ہوتا کچھ نہیں ہے لیکن سب کچھ بن سکتا ہے یا بالکل ضائع ہو سکتا ہے اسے سماعت اور بصارت کے ساتھ دل و دماغ کی صلاحیتیں بھی عطا ہوتی ہیں۔ اور جس طرح آواز سماعت کو اور روشنی بصارت کو کام میں لانے کے لئے ضروری ہے اسی طرح دل و دماغ کی رہنمائی کے لئے الہی ہدایت ضروری ہے اسی ہدایت سے محروم انسان زندگی کا سفر اندھیرے میں کرتا ہے۔ مغرب کا فلسفۂ تعلیم زندگی کی راہوں کا تعین تو کرتا ہے لیکن ایمان کی روشنی سے محروم ہے۔ ہمارا ایمان ہمیں یہ روشنی فراہم کرتا ہے بقول اقبال ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں، روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

[illegible] کو بھی محسوس کر لیا تھا گویا اقبال

نے بیسویں صدی کی فضا سے "پیکار" کی بو سونگھ لی تھی اور اب اس سے انگیخت کے تقاضے تھے چنانچہ اقبال کی نظم نے نہ صرف جدلیات کے مظاہر اور تصورات کو اپنے اندر جذب کیا بلکہ تصادم اور آویزش کے اندر سے مجرد یکتائی کے تصور کو بھی ابھارا۔ اقبال کا خیال کہ جبر اور اختیار باہم متصادم نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں اور انسان بیک وقت آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔ ایک ایسا نظریہ تھا جو پیکار اور آویزش کا منہ چڑا رہا تھا۔ ہر چند جدید اردو نظم نے ویسٹ لینڈ کے تصور کی طرح پیکار کے مظاہر کو براہ راست بھی محسوس کیا اور ترقی پسند نظم تو بالخصوص مادی سطح کی پیکار سے بری طرح متاثر ہوئی تاہم اقبال کے معتدل اور متوازن رویے نے یہاں بھی جدید اردو نظم پر اپنے اثرات کچھ یوں مرتسم کیے کہ نظم لکھنے والوں نے مادی جدلیات کو عبور کرکے کائناتی جدلیات کا ادراک کر لیا اور پھر پیکار کی سطح سے "اکائی" کی سطح پر اٹھ آئے۔ یہ ایک خالص مشرقی انداز فکر تھا جو اقبال کی وساطت سے جدید اردو نظم کے پیکر میں شامل ہوا اور اسے ایک خاص مزاج تفویض کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو گیا۔

* * *

(بقیہ صفحہ ۲ کا)

چلتا ہے: "میں جامعہ میں مہمان بن کر نہیں آیا ہوں"

جامعہ میں سالانہ امتحانات اور تعطیل

جامعہ میں

سالانہ امتحانات ۱۳ رمئی سے شروع ہو کر ۲ رجون کو ختم ہو گئے۔ اور ۳ جون کو طلبہ اپنے اپنے گھروں کے لئے روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بخیر و عافیت اپنے گھروں تک پہنچائے۔ وہاں پہنچ کر وہ والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوں۔ انکے لئے آرام و سکون کا باعث بنیں۔ جامعہ کی نیک نامی کریں۔ رمضان المبارک کی برکتوں اور عید الفطر کی خوشیوں سے ہمکنار ہوں۔

۱۰ رشوال مطابق ۲۳ جولائی کو جامعہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہوگا۔ امید ہے کہ تمام طلبہ ۱۱ رشوال کی شام تک جامعہ پہنچ جائیں گے۔

برادر اطہر ریحان فلاحی جو الجبیل میں مقیم تھے، اب ان کا پتہ بدل گیا ہے۔ اب حسب ذیل پتہ پر خط و کتابت کیجئے:

Dr. Athar Raihan Falahi
P. Box 10038
Jubail Industrial City. K.S.A

ام فاروق (لاہور)

ادبِ اسلام اور خواتین

ادب زندگی کا بڑا حصہ ہو اور زندگی کو سنوارنے کا سب سے بہتر کام اسلام نے سرانجام دیا ہے اس لئے اسلامی ادب کی سمت متعین کرنے کا بنیادی نظریہ ہونا چاہئے جس میں مردوں اور عورتوں میں امتیاز نہیں ہے۔ دینِ اسلام مردوں اور عورتوں دونوں کو مساوی طور پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کے ذمے انفرادی فرائض لگاتا ہے۔ اور دین کے قیام کی جدوجہد کے لئے دونوں کو یکساں پکارتا ہے۔ ایمان قبول کرنے اس پر عمل پیرا ہونے اور اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی میں دونوں برابر ہیں نہ کوئی ایک دوسرے کے لئے چھٹکارے کا باعث بن سکتا ہے اور نہ کسی ایک کی عبادات کا عوض دے کر کوئی دوسرا چھوٹ سکتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی۔ جس کی وضاحت کے لئے حضور نے اپنے گھر کی دو نہایت عزیز خواتین کو ان الفاظ میں مخاطب فرمایا تھا۔

اے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ اور اے رسول کی پھوپھی صفیہ دوزخ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرو کیونکہ میرا رشتہ تمہارے لئے خدا کے ہاں مفید نہیں ہو سکتا۔

جوابدہی میں انفرادی ذمہ داری

آخرت میں سرخروئی اور مالک سے مغفرت پالینے کی جدوجہد مرد اور عورت دونوں کے لئے ضروری ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعاون کے ذریعے اپنے اعمال میں اضافہ تو کر سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آخرت میں اپنے نامۂ اعمال بدل لیں یا اپنی نیکیاں ایک دوسرے کو منتقل کر کے ایک دوسرے کو بچا لیں۔ رب کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی ایک ایسا خالص انفرادی معاملہ ہے جس میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ کوئی کسی پر الزام دھر کر بچ نہیں سکتا۔ اور کوئی کسی سے کچھ دے کر جان نہیں چھڑا سکتا۔ مالک کی طرف سے عائد شدہ فرائض کو پورا کرنے، مالک کے مطیع اطاعت گزار اور وفادار غلام کا اپنا کام اور سر مطیع فرمان اور وفادار بندگی کا اپنا ہے۔ وہ فرائض بھی جو مالک نے اپنے غلاموں اور اپنی لونڈیوں پر ان کی انفرادی حیثیت میں عائد کئے ہیں اور درحقیقت اجتماعی فرائض بھی انفرادی جدوجہد کے ذریعے ہی ادا ہو سکتے ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے بڑا اجتماعی فریضہ دین کی سربلندی کی جدوجہد ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیا ہے احساس، کہہ کر اپنی بندگی کی طرف بلاتا ہے۔ اور اس میں مردوں عورتوں کی کوئی تخصیص نہیں فرماتا پھر ایمان والوں کو (یا ایہا الذین آمنو) کہہ کر پکارتا ہے اور ان پر فرائض عائد کرتا ہے۔ اور انہیں بھی عورتوں اور مردوں

کی کوئی مخصوص شعور آیا۔ اس لئے سب سے پہلے یہ بات ذہن سے نکال دینے کی ہے کہ دین کو سربلند کرنے اور اسے قائم کرنے کا فریضہ صرف مردوں پر ہے۔ عورتوں پر اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر کسی درجے میں ہے بھی تو بس ہلکے پھلکے انداز میں محض اضافی اجر حاصل کرنے کی خاطر ہے۔ ورنہ عورت تو مرد کے تابع فرمان ہونے کمزور جسم ہونے اور بچوں میں مصروف ہونے کے سبب ان ساری ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہے اور مرد ہے۔ ان کی طرف سے ان کی دینی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے مرد کافی ہیں۔ اور وہ جس نوعیت کی بھی ذمہ داری ادا کریں اس کے سوا بھلا کیا چارہ کار ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا کے ساتھ طرزِ عمل کا یہ تصور کسی صنف کے لئے بھی درست نہیں ہے۔ اگر مردوں کی طرف سے کیا ہوا دینی کام ہی عورتوں کے لئے کافی ہوتا تو حضرت نوحؑ کی صدیوں کی پر مشقت دعوتِ دین ان کی اہلیہ کو ضرور بچا لیتی لیکن قرآن گواہ ہے کہ وہ نہ بچا سکی۔ حضرت لوطؑ کے اپنے مالک کی راہ میں اٹھائے ہوئے مصائب ان کی بیوی کو بچا لیتے لیکن عذاب تک پتھروں کی مار سے اسے نہ بچا سکے۔ اسی طرح اگر عورتوں کا دین مردوں کے حوالے ہی ہوتا تو فرعون کی بیوی کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اپنے علیحدہ دینی حق کا اظہار کر کے آزمائشوں میں مبتلا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر مسلمان مرد کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی آخرت کی فکر کرے اللہ اپنے دینی فرائض کو خود ادا کرے اور ان فرائض میں سب سے بڑا فریضہ دین کو قائم کرنا اور اس کی علمداری کے اجرا کا فریضہ ہے جس کی طرف سے جو بھی غفلت برتے گا اپنے نامہ اعمال کو اسی قدر ہلکا اور بے وزن پائے گا اور آخرت کی باز پرس کا اسی قدر مستحق ٹھہرے گا۔ اپنے گھروں میں خواتین کے نان و نفقہ اور دیگر مسائل سے جس طرح خود پہلو تہی نہیں کر سکتے اس لئے کہ انہیں گھروں میں قوام کی حیثیت دی گئی ہے۔ اور ان کے اثرات غالب تر رکھے گئے ہیں اسی طرح خواتین کی دینی تعلیم و تربیت اور ان کے دینی مسائل کے بارہ میں بھی وہ کلیتہً بری الذمہ نہیں ہو سکتے خود ان کے دین نے ان کو یہ حکم دیا ہے کہ۔

قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم)

ترجمہ:- اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔

اور ظاہر ہے کہ آگ سے بچانے کے لئے ایمان اللہ کی اطاعت و خشیت دینی احکام کی پابندی اور اصلاحی ذمہ داریوں کو ادا کرنے پر آمادہ کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کے غضب کی آگ سے بچ سکیں اور اس اصلاحی تربیت کے لئے ان کو دعا سکھائی گئی ہے۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔

اے ہمارے رب عطا فرما تو ہمیں اپنے اہل خانہ اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمیں نیک لوگوں کا پیشوا بنا۔ یعنی ہمیں اتنی توفیق عطا فرما کہ ہمارے زیر اثر جو لوگ بھی ہوں وہ نیک اور خدا سے ڈرنے والے ہوں اس طرح اولاد کے معاملے میں ان کی دینی تربیت کی ذمہ داری مردوں سے بڑھ کر عورتوں پر ہے۔ اس لئے کہ بچوں کی تربیت میں باپ سے بڑھ کر ماں کے اثرات کام کرتے ہیں۔ بچوں کے چھوٹے چھوٹے ذہنوں میں اوّلین اثرات ان کی ماؤں کی طرف سے قائم ہوتے ہیں جیسے کسی چھوٹے پودے کے تنے پر کوئی نقش بنا دیا جائے تو وہ پودے کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ابتدائی زندگی زندگی کے نقوش بعد میں آنے والی زندگی کے متعلق نقوش کی صورت میں بچوں کی شخصیت پر نقش ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماں اور باپ دونوں میں جو اپنے

دینی اور اخلاقی کردار میں کوئی کمزوری رکھتا ہے۔ بالعموم وہ کمزوری اولاد میں نمودار ہو کر رہتی ہے۔ انسانی فطرت شہوت پسند واقع ہوئی ہے اور اگر دونوں میں سے کسی ایک کی زندگی دینی حدود و قیود کی پابندی سے جس جس درجے میں آزاد ہوتی ہے۔ اس درجے میں بچے اس سہولت سے غیر شعوری طور پر فائدہ اٹھاتے اور اسے نمونہ بنا کر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر دینی امور کی انجام دہی میں باپ کے اندر کوتاہیاں ہیں۔ تو بچے اس سے وہ کوتاہیاں وصول کر لیتے ہیں اور اگر ماں کے اندر کمزوری ہے تو وہ کمزوری ماں سے قبول کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چاہے بچے ماں باپ کی ساری خوبیوں کے حامل نہ ہوں لیکن بالعموم دونوں کی کمزوریاں چن چن کر وہ اپنے اندر ضرور جمع کر لیتے ہیں اسلئے والدین میں سے کبھی جو اپنے اندر دین کی طرف سے لاپرواہی یا اخلاقی حدود کی عملی بےحرمتی کا شکار ہوتا ہے وہ دراصل اپنی اولاد کو بھی اسی کوتاہی کا پروانہ راہداری دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

قرآن نے مرد و زن کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔

هن لباس لکم وانتم لباس لهن (البقرہ)

وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو

اگر لباس کے تقاضوں کا اہتمام دونوں میاں بیوی باہمی ایک... دوسرے کے لئے نہیں کرتے ایک دوسرے کی اخلاقی ستر پوشی ایک دوسرے کی خرابیوں کو رفع کرنے کی کوشش اور باہمی ایک دوسرے کی عزت و اخلاق و آبرو کی حفاظت کا اہتمام نہیں ہوتا۔ تو پھر خرابی ضرور اولاد کی طرف منتقل ہو کر رہتی ہے۔ گویا جو ناقص اخلاقی بیج ہو گا وہ بھی بچوں کی معصوم فطری کھیتی میں جڑ پکڑ کر رہے گا۔ اور اگر میاں بیوی اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی کے لئے فریق ثانی کی کمزوریاں بیان کرنے لگیں پھر تو ان دونوں کی کمزوریاں کھل کر اولاد کے سامنے آتی ہیں۔ اور مستقلاً ان کے کردار میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اسطرح باہمی لڑائیوں اور تنازعات... سے بھی والدین کی کمزوریاں اولاد کے سامنے آتی ہیں اور ان کی جو ناگوار فضا اور اولاد پر رعب زائل ہوتا ہے، جو تربیت بگاڑنے کا بڑا سبب بنتا ہے۔

اس سلسلے میں گھر کے اندر اجتماعی مطالعہ کا اہتمام بھی اہل خانہ کی اخلاقی تربیت میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اگر دوسرے کاموں کی طرح اس کام کے لئے بھی نماز فجر یا عشاء کے بعد خصوصیت سے کچھ وقت نکالا جائے جس میں سب افراد خانہ جمع ہو کر بیٹھیں اور چند آیات قرآنی کا ترجمہ و تفسیر اور چند احادیث نبوی کا مطالعہ اجتماعی طور پر روزانہ کر لیا کریں۔ تو اس سے بچوں کے بنیادی اخلاقیات میں قرآن و حدیث کے احکام کے اثرات نہایت تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ اترتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو باتیں سادہ نصیحت کے خشک الفاظ میں بیان کرنے سے بچوں پر بعض حالات میں رد عمل کے سبب اسکے اثرات، ذاتی ہیں وہی باتیں مطالعہ کی غیر جانبدارانہ اور غیر ناصحانہ فضا میں زیادہ کشادہ دلی سے قبول کر لی جاتی ہیں۔

تربیت کا حق ادا کرنے کے لئے مختلف اوقات میں خصوصی رغبت و توجہ کرنا بہت ضروری ہے۔ انکے خیالات معلوم کرنا۔ ان کے جذبات، ان کی ضروریات اور ان کی دلچسپیوں کا اندازہ لگانا اور ان کی ذہنی مشکلات میں رہنمائی اور مشورے دینا نہایت مفید اثرات رکھتا ہے جس سے تکلفات اور اجنبی بیزاری کی فضا کے بجائے بے تکلفی اور اپنائیت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اہل خانہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فراخ دستی اور کشادہ دلی سے پیش آنے کی ضرورت بھی مسلم ہے۔ ان میں بالکل یہ احساس نہ پیدا ہونے پائے کہ زندگی کے موجودہ وسائل کے مقابلہ میں ہمارے ساتھ تنگ دلی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس طرح ماحول اور معاشرے کی طرف سے داخل ہونے والی برائیوں کا بھی

برداشت نہ کیا جائے اور اس سلسلے میں برملا سختی کی جائے تاکہ اس خاندان کے فرد فرد کو یہ اچھی طرح معلوم ہو کہ ہمارے یہاں فلاں فلاں حدود مقرر ہیں۔ مادی آسائشوں میں امکانی حد تک رعایت ہوگی، اخلاقی خوبیوں کی تعریف اور ہمت افزائی ہوگی اور اخلاقی برائیوں میں شدت اور سختی ہوگی اور ان میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ گھر میں ایسی جاذب اچھی فضا پیدا کرنے سے تربیت کا بہت کچھ تقاضا پورا ہو جاتا ہے جس میں برائی کے رکنے اور بھلائی کے پرورش پانے کا امکان قائم رہتا ہے۔ گھر کے داخلی ماحول کی تشکیل اور بچوں پر اثر انداز ہونے میں مردوں سے کہیں زیادہ عورتوں کی ذمہ داری ہے۔ ان کا کام صرف امور خانہ داری کو سرانجام دینا ہی نہیں ہے، جو کوئی ملازم بھی سرانجام دے سکتی ہے بلکہ ان کی اصل ذمہ داری آئندہ بننے والی ایک عظیم قوم کی چھوٹی سی پود کی نگہداشت ہے جو ہر گھر میں علیحدہ علیحدہ پرورش پا رہی ہے اور انفرادی توجہ اور عمدہ تربیت کی مستحق ہے۔ ان کی مشفقانہ نگہداشت، عمدہ انتظام، صالح پرورش، دیانتدارانہ اخلاق، محنت و مشقت کی عادت، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ، خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت اور ان کی عظمت کا گہرا تصور، دوسرے انسانوں سے ہمدردی، اخوت اور دیانتداری، معروف سے محبت اور منکر سے اجتناب کا جذبہ ایک ماں ہی اپنی اولاد کے اندر مختلف تدابیر سے آہستہ آہستہ پیدا کر سکتی ہے۔ پرورش مند دیندار مائیں اپنے بچوں کے ہاتھوں سے محتاجوں کو صدقات دلواتی ہیں۔ بچوں کی صداقت اور دیانت کی ہمت افزائی کرتی ہیں۔ ان کے کئے ہوئے اچھے کام کو سراہتی اور انہیں انعام دیتی ہیں۔ بڑے بچوں کو کچھ زیادہ دے کر بھی آمادہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے حصے میں سے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو فراخ دلی سے دیں اور ان پر ایثار کریں، گالی گلوچ پر سختی سے روکتی ہیں۔ نمازوں کیلئے اکساتی اور بچوں کے روزے رکھنے پر تقریبیں منعقد کرتی ہیں۔ صفائی اور ستھرائی کا عملی سبق دیتی ہیں۔ قرآن اور حدیث سے چھوٹی چھوٹی اور اچھی اچھی باتیں بتاتی ہیں۔ صحابہ اور بزرگوں کے دین کیلئے ایثار، قربانی اور جاں فروشی کے واقعات قصہ کہانی کی صورت میں سناتی ہیں اور جن باتوں کی تلقین کرتی ہیں ان کا سختی سے خود بھی اہتمام کرتی ہیں۔ اور اس امر کا احساس رکھتی ہیں کہ بچے کے دل و دماغ کی لوح پر اس کی آنکھ کا کیمرہ اپنے بڑوں کے سامنے کردار اور ایک ایک حرکت کی تصاویر نہایت خاموشی سے اتارتا چلا جاتا ہے اور پھر ان سے زندگی کے سبق سیکھتا ہے۔ چنانچہ ماؤں کے بہترین عملی نمونے کے نتیجے میں بچوں کے اندر ان باتوں کی سچائی کا یقین بیٹھتا چلا جاتا ہے اور ماؤں کی عمدہ تربیت بچوں کے اندر ماں کے دودھ کی طرح اترتی رہتی ہے۔ اسی لئے جو لوگ بچپن بگڑ جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تو کبھی بگڑے ہوئے ہیں۔ بچپن کی فطرت میں اس وقت ہی بگاڑ ڈال دیا گیا تھا جب وہ ماں کی گود میں تھے۔ اور انہیں کسی برائی بھلائی کا ہوش نہ تھا۔

بچوں کے سامنے عملی مثال سے بڑھ کر تربیت کا کوئی عمدہ ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ عمل ہی الفاظ میں تاثیر اور تلقین میں حسن قبولیت پیدا کرتا ہے۔ اس حکمت کے پیش نظر ایک مشہور بزرگ نے ایک بچے کو اس وقت تک نصیحت نہ کی تھی جب تک خود بھی عملی طور پر اس نصیحت پر عامل نہ ہو گئے تھے۔ بچوں کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہے کہ ان کو انہیں باتوں کی نصیحت کی جائے جن پر والدین خود عامل نہ ہوں۔ اس سے نہ صرف بچوں پر ایسی نصیحت کا کبھی اثر نہیں ہوتا بلکہ ان کے اخلاق میں نفاق کا بیج پیوست ہو جاتا ہے۔ اور وہ عمر بھر اپنے قول کے خلاف عمل کرتے پھرتے ہیں۔ اور انہیں اس

راہ کا شعور تک نہیں ہوتا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے قرآن و حدیث کی موجودگی اور حضور اور صحابہ کی تاباں زندگی کے مکمل نمونے کے باوجود مسلمانوں میں بے عملی، بدعملی اور نفاق کا مرض عام کر دیا ہے۔

صحابیات کا طریقہ یہی تھا کہ وہ بچوں میں اپنے عمل سے دین کی تعلیم اتارتی تھیں۔ بچوں کو اپنے گھروں میں دین حق صرف کتابوں میں ہی نہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی انسانوں کی صورت میں چلتا پھرتا نظر آتا تھا البتہ اس کے خلاف عمل کرنا یا سوچنا بچوں کیلئے مشکل ہوتا تھا۔ صحابیات اپنے بچوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاتیں اور ان کیلئے دعائیں کرواتیں ان کے اچھے اچھے نام رکھتیں ان کو دین کی تعلیم دیتیں۔ ان کے اندر جہاد میں شہادت پانے کا جذبہ ابھارتیں۔ خود حضور کی مجلس میں جا کر دین کی تعلیم حاصل کرتیں۔ سوالات کے ذریعے اپنی زندگی کی مشکلات کو حل کرتیں۔ اپنے اجتماعات کیلئے حضور سے خصوصی وقت طلب کرتیں اور دین کیلئے بڑی سرگرمی اور دلچسپی دکھاتیں۔ آج ہمارے پاس عائلی اور معاشرتی زندگی کا ایک منضبط جامع اور بہترین نظام موجود ہے۔ اس کی ترتیب میں ان محترم خواتین کا بڑا حصہ ہے۔ جنہوں نے حضور اکرم سے عائلی زندگی کے بارے میں سوال پوچھ پوچھ کر عائلی زندگی کا اسلامی ضابطہ مرتب کر کے خواتین پر عظیم احسان کیا ہے۔

٭٭٭

(بقیہ ص ۱۹)

قدم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو
وہ فاقہ مست کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو

اگر افغانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

روس نے افغانستان پر حملہ کر کے اپنے تابوت میں پہلی کیل ٹھونک لی ہے۔ کیونکہ اگر روس کی کھلی ہوئی جارحیت میدان میں نہ آتی تو بہت ممکن تھا کہ روس اپنے ایجنٹوں اور خفیہ تنظیموں کے ذریعے بتدریج افغانیوں کے بدن سے روح محمد نکال کر ان کے گلے میں کمیونزم کا طوق ڈال دیتے اور ان سادہ دل کوہستانی مردوں کو اپنی تحریک ایمان شکنی کے لئے جاں نثار بھی کر لیتا۔ اگر اس جنگ میں افغان مجاہدین نے روس کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر ترکستان، تاجکستان، قازقستان اور وسط ایشیا کی دوسری ریاستیں جو عرصہ دراز سے روسی سامراج کے شکنجے ظلم و جبر کی چکی میں پس رہی ہیں۔ ان کے دلوں میں ابھی ایمان و یقین کی چنگاری تو باقی ہے۔ افغانستان کی آزادی کی بدولت سلگ سکتی ہے۔ وہ اپنی آزادی اور خود مختاری کیلئے تیار ہو سکتی ہیں۔ اور روس کا سرمایہ دریائے جیحون کے کنارے سے اکھاڑ کر [illegible] سے [illegible] سے بھی آگے جا سکتی ہے۔ جس طرح سے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور سوڈان کے جیالوں نے برطانیہ کو [illegible] اپنی اصلی سرحد میں لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ افغانستان [illegible] بے گناہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کی بے دریغ شہادت ہرگز ضائع نہیں جانے دی جا سکتی ہے [illegible] مسلمانوں کی آزادی کا عنوان بن جائے۔

٭٭٭

سلطان احمد اصلاحی

مساوات کی آبیاری میں اسلام کے عطا کردہ قانونی تحفظات

اسلام نے انسانی سماج میں مساوات کی آبیاری کے لئے صرف ترغیب و تلقین پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کے لئے قانونی تحفظات بھی فراہم کئے ہیں۔ اور اس کا تعلق بھی زندگی کے کسی ایک گوشے سے نہیں بلکہ اس کے تمام دائروں سے ہے۔ چنانچہ عقائد و عبادات سے لیکر قصاص و دیت اور حدود و تعزیرات تک زندگی کے ہر دائرے میں اسلام نے یہ قانونی تحفظات فراہم کئے ہیں۔ اور زندگی کا کوئی دائرہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جس میں ذات برادری، قومیت و وطنیت اور زبان و علاقیت جیسے امتیازات کا سہارا لیکر دو انسانوں کے درمیان کوئی فرق روا رکھا جا سکے۔ یا کسی کو امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جا سکے۔

عقائد میں عقائد کی انسانی زندگی میں جو اہمیت ہے وہ اس سے ہر شخص واقف ہے۔ پھر کسی شخص کے معتقدات ہی اس کے اعمال کی بنیاد ہوتے ہیں۔ یعنی ہمارے عقائد ہمارے عمل کی بنیاد ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا نے انسانیت کو جن عوامل کے زیر سایہ نابرابری اور عدم مساوات کی لعنت کا شکار ہونا پڑا ہے اس میں عقائد کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ چنانچہ مشرک اقوام میں عام طور پر کچھ لوگوں نے اپنے کو دیوی دیوتاؤں کا نمائندہ اور ان کا جانشین قرار دے کر دوسرے انسانوں کو اپنے سے کمتر قرار دیا اور انہیں مستقل طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ آج بھی بہت سے لوگ اپنے تئیں سورج دیوتا اور چاند کی اولاد سورج بنسی اور چندر بنسی ہونے کے مدعی ہیں۔ اسلام نے اپنے عقائد کے تمام اجزاء میں دنیا کے تمام انسانوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل یکساں (....) قرار دے کر ہر انسان کو یہ قانونی تحفظ عطا کیا ہے کہ اس کے ساتھ زندگی کے کسی میدان میں نابرابری کا سلوک روا نہ رکھا جا سکے اور طبقۂ انسانیت کسی دیوی دیوتا کا نام لیکر دوسرے انسانوں پر اپنی چودھراہٹ قائم نہ کر سکے۔

خدا عقائد کی اس فہرست میں خدا کے وجود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دراصل یہی وہ نقطہ ہے جس کے گرد تمام ادیان کا نظام گردش کرتا ہے۔ اسلام خدا کی اس ذات سے متعلق یہ ضمانت فراہم کرتا ہے کہ اس کا تعلق مخصوص طور پر کسی ایک قوم یا ایک طبقۂ انسانیت سے نہیں بلکہ وہ تمام انسانوں کا یکساں خدا ہے۔ سارے انسان یکساں طور پر اس کے بندے ہیں اور وہ دونوں جہان کو پالنے والا ہے۔ چنانچہ اسلام کے دستور اساسی (قرآن کریم) کا آغاز ہی اس حقیقت سے ہوتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ — سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو سارے عالم کا پالنے والا ہے

اس کے علاوہ قرآن بار بار تمام انسانوں کو یکساں طور پر خطاب کرتا ہے۔ اور تمام انسانوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل بندگی رب کا پیغام سناتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ — اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے اگلوں کو تاکہ تم بچ جاؤ۔

(البقرہ ۲۱)

(۲) يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ (النساء - ۱)

اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور پیدا کیا اس سے اس کا جوڑا۔ اور پھیلائے ان دونوں سے بے شمار مرد اور عورتیں اور ڈرو اللہ سے جس کا نام آپس میں واسطہ دیتے ہو اور خبردار رہو رشتوں سے بیشک اللہ تم پر نگہبان ہو۔

اس طرح گویا انسان کو دستوری ضمانت مل جاتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کر سکے اور معاشرے میں اپنے جائز مقام کو حاصل کر سکے۔ بحیثیت انسان اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکے اور طبقہ انسانیت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار نہ ہو۔

رسول

خدا کے اقرار (یعنی توحید) کے بعد اسلامی عقائد میں جو چیز کلیدی اہمیت کی حامل ہے وہ رسالت کا اقرار ہے۔ یعنی یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ آپ کے بعد قیامت تک کیلئے کوئی نبی نہیں آئیگا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے سلسلے میں بھی یہ دستوری ضمانت فراہم کرتا ہے کہ آپ کا تعلق مخصوص طور پر کسی قوم قبیلے یا کسی ایک خطہ ارض کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ آپ تمام دنیا والوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ہر شخص جو آپ کی پیروی اختیار کرے اس سے آپ کا یکساں تعلق ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ ......

کہہ دو اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کی حکومت ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ کوئی نہیں معبود سوائے اس کے وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اس نبی امی پر ......

......

وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

(الاعراف ۱۵۸)

جو یقین رکھتا ہے اور اس کی تمام باتوں پر اور اس کی پیروی کرو۔ شاید تم راہ پاؤ۔

اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ آپ کی رسالت کسی ایک قوم یا مخصوص طور پر کسی ایک خطہ زمین کے لوگوں کے لیے نہیں۔ بلکہ رسالت کا یہ فیض دنیائے انسانیت کے لیے عام ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(سبا ۲۸)

اور ہم نے تم کو بھیجا ہے سارے لوگوں کے واسطے خوشخبری دینے کو اور ڈر سنانے کو، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر قرآن صراحت کرتا ہے کہ آپ کی ذات بابرکات دنیا جہاں کے لوگوں کے لئے رحمت ہے کسی طبقۂ انسانیت کے لئے اس کے اندر کوئی تخصیص نہیں

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ (انبیاء - ۱۰۷)

(اور ہم نے تجھ کو بھیجا ہی ہے دنیا جہاں والوں کے لئے رحمت بنا کر)

اس کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کے اندر بھی اس حقیقت کو دو ٹوک لفظوں میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ [۱]

(مجھ کو گورے اور کالے سب کی طرف یکساں طور پر بھیجا گیا ہے)

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں!

إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَى الْأَنَامِ كَافَّةً

(میں اللہ کا رسول ہوں ساری مخلوق کی طرف)

قرآن:۔ اسلام نے اپنے عقائد کے ان اہم ترین اجزاء کے ساتھ اپنے دستور اساسی (قرآن حکیم) کو دنیائے انسانیت کے لئے عام رکھا ہے۔ ویدوں کی تعلیم تو یہ ہے کہ:

"اگر کوئی شودر بالارادہ وید کے الفاظ سن لے تو اس کے کان میں پگھلی ہوئی رانگ یا لاکھ ڈال دی جائے۔ اگر وید کی عبارت پڑھے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے۔ اور اگر وہ یاد کرے تو اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں" [۳]

لیکن اسلام اپنے مقدس صحیفے کو تمام انسانوں کے لئے عام قرار دیتا ہے اور خود قرآن ہی کی زبان سے اس کے لئے یہ شہادت فراہم کرتا ہے

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ (البقرہ ۱۸۵)

(رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا جو ہدایت ہے تمام انسانوں کے لئے اور راہ کی کھلی ہوئی نشانیاں اور فیصلہ کن چیز)

اور یہی نہیں بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تاکید کی جاتی ہے کہ آپ اس کو تمام دنیا کے انسانوں پر پڑھ کر سنا دیں۔

وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيلًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۰۶)

(اور قرآن کو ہم نے اس کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں رکھا تاکہ تو اس کو پڑھے تمام لوگوں کو پر ٹھہر ٹھہر کر۔ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا)

اس کے علاوہ قرآن بار بار اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا خطاب پوری دنیائے انسانیت سے ہے کسی گروہ کو اس پر اپنی اجارہ داری مسلط کرنے کا حق نہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ (یونس ۵۷)

(اے لوگو! تمہارے پاس آگئی ہے نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور اس میں شفا ہے دلوں کی بیماریوں کی اور وہ ہدایت اور رحمت ہے یقین لانے والوں کے لئے)

---

[۱] مسند احمد جلد ۵/۱۴۵ [۲] کنز العمال جلد ۱/۵۵

[۳] گوتم ۱۲/۴،۵،۶ بحوالہ الجہاد فی الاسلام ۳۴۶

اس طرح اسلام تمام انسانوں کے لئے قرآن سے فیض یاب ہونے کے لئے قانونی حق عطا کرتا ہے وہ اپنی زبان سے اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ وہ مخصوص طور پر کسی ایک طبقہ کو انسانیت کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی تمام انسانوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے آیا ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (جاثیہ۔ ۲۰)

(یہ سمجھنے والی باتیں ہیں سارے انسانوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ہے ان کے لئے جو یقین لائیں)

نیز یہ کہ وہ دنیا جہاں والوں کی یاد دہانی کے لئے آیا ہے۔

(۱) وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (قلم۔ ۵۲)

(۲) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (تکویر۔ ۲۷)

(یہ تو بس یاددہانی ہے تمام دنیا والوں کے لئے)

عبادات میں

عقائد کی طرح عبادات میں بھی اسلام اسی بین الانسانی رویے کا قائل ہے۔ دنیا میں جو طبقہ انسانیت خدا سے خصوصی تعلق کے دعویدار رہے ہیں انھوں نے عام طور پر عبادات اور مذہبی مراسم کی ادائیگی کو بھی اپنا خصوصی حق گردانا ہے۔ چنانچہ منوسمرتی ایک برہمن کو تاکید کرتی ہے کہ

"وہ شودر کے سامنے وید نہ پڑھے" (۴ : ۹۹)

لیکن اسلام اپنی عبادات میں دنیا کے تمام انسانوں کو شامل قرار دیتا ہے اور اس طرح اس نے ہر انسان کے لئے قانونی تحفظ عطا کیا ہے کہ کوئی طبقہ انسانیت اسے اپنے اس حق سے محروم نہ کر سکے چنانچہ نماز کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراحت فرماتے ہیں کہ

خَمْسُ صَلَوَاتٍ كَتَبَهُنَّ اللّٰهُ عَلَى الْعِبَادِ

(پانچ نمازیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے تمام بندوں پر)

اسی طرح حج کے سلسلے میں قرآن صراحت کرتا ہے کہ اس کی فرضیت تمام انسانوں کے لئے ہے کسی طبقہ انسانیت کو اس پر اجارہ داری کرنے کا حق نہیں۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران ۹۷)

(اور اللہ کا حق ہے تمام انسانوں پر خانہ کعبہ کا حج کرنا جو کوئی اس تک راہ پائے اور جو اس کا کفر کرے تو اللہ بے نیاز ہے سارے جہاں والوں سے)

مرکز عبادت میں اشتراک

جس طرح اسلام نے عبادات کے سلسلے میں تمام انسانوں کو قانونی تحفظات عطا کئے ہیں اسی طرح اس نے اپنے مرکز عبادت کے دروازے دنیا کے تمام انسانوں کیلئے کھلا رکھا ہے اور اس سے فیض یابی کو ہر انسان کا قانونی حق قرار دیا ہے۔ دنیا میں جو محروم طبقات نابرابری (INEQUALITY) کی لعنت کا شکار رہے ہیں انہیں عبادت کے مراکز سے بھی ہمیشہ دور رکھا گیا ہے۔ آج ترقی یافتہ ہندوستان میں بھی اچھوتوں کے مندروں میں داخلے کو یا دل ناخواستہ ہی انگیز کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں آئے دن

ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب

الگ سے اپنے اچھوت مندر تعمیر کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے[44] اسی طرح مسیحیت بھی، مساوات کے اپنے ہزاروں دعوؤں کے باوجود دنیا کے دوسرے انسانوں کو یہ حق فراہم کرنے سے قاصر ہے چنانچہ آج جنوبی افریقہ میں جہاں سیاہ فام (BLACK) آبادی کے تعلیمی ادارے اور چلنے کے راستے الگ ہیں وہیں ان کے چرچ بھی الگ سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ سفید فام (WHITE) آبادی کے ساتھ وہ چرچ میں اپنے مذہبی فرائض کو ادا نہیں کر سکتے۔

اسلام اس کے برعکس اپنے مرکزِ عبادت کو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے عام قرار دیتا ہے۔ قرآن صراحت کرتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوئی ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۝

بے شک (عبادت کا) پہلا گھر جو تعمیر ہوا سارے انسانوں کے لیے وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور سرچشمہ ہدایت تمام دنیا والوں کے لئے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ جو کوئی اس میں داخل ہوا امن میں آگیا)

اسی طرح دوسرے مقام پر قرآن تاکید کرتا ہے کہ اللہ کے اس گھر کے دروازے تمام انسانوں کے لئے کھلے ہونے چاہئیں اور اس کی نسبت سے اپنے پرائے، ملکی اور غیر ملکی کا کوئی امتیاز روا رکھنا جائز نہیں۔ ایسا کرنے والے کو قرآن دردناک عذاب کی دھمکی دیتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ (حج ۲۵)

(بے شک جو لوگ [کافر ہوئے] ہیں اور روکتے ہیں اللہ کی راہ اور مسجد حرام سے جسے ہم نے قرار دیا ہے سارے انسانوں کیلئے کہ برابر ہیں اس میں لگے رہنے والے اور باہر سے آنے والے اور جو کوئی چاہے اس میں کجی شرارت سے اسے ہم دردناک عذاب چکھائیں گے۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر تاریخ کی شہادت ثبت ہے چنانچہ آج بھی حج کے ہر سالانہ اجتماع میں اس حقیقت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا جا سکتا ہے جہاں دنیا کے ہر خطے کے مسلمان، کالے، گورے، عربی، عجمی، ایشائی، افریقی اور سندی و چینی کے اختلافات کو بھلا کر کندھے سے کندھا ملائے اپنے محبوب کے در پر پروانہ وار چکر لگا رہے ہوتے ہیں۔

معاشرتی تعلقات میں

اسلام نے جس طرح عقائد و عبادات کے دائرے میں تمام انسانوں کے درمیان مساوات قائم کی ہے، اسی طرح اس نے معاشرتی تعلقات میں بھی ہر کلمہ گو کو یکساں قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں کسی رنگ و نسل، قوم قبیلے اور علاقائیت و وطنیت کے اعتبارات کو قابلِ التفات نہیں تصور کیا ہے کوئی نظامِ فکر و عمل دنیائے انسانیت کو آزادی و مساوات جیسی قدروں سے کس حد تک بہرہ مند کر سکتا ہے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جبکہ یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنے ماننے والوں یا اس کے علاوہ اس نے جن اعضو وں کیلئے مجوزہ اصول کیا ہے ان کے ساتھ وہ کس نسبت سے ان قدروں کی بنیادی ضمانت فراہم کرتا ہے اس لئے کہ اسی صورت میں وہ اصل میں نظام کے خد و خال جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسلام کا نظامِ فکر و عمل سچے معنوں میں بین الانسانی حیثیت کا حامل ہے چنانچہ اس کا خطاب بلا امتیاز رنگ و نسل پوری دنیائے انسانیت سے ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں

تو دیکھتے ہیں کہ ایک رشتۂ اسلام و ایمان کے سوا اس نے تمام تعصبات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے، چنانچہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیتا ہے اور پوری اسلامی برادری کو ایک جسم کے اعضاء کے مانند تصور کرتا ہے قطع نظر اس سے کہ ان کا تعلق کس قوم اور کس قبیلے سے ہے یا وہ کس ملک اور کس علاقے سے تعلق رکھنے والے ہیں چنانچہ قرآن صراحت کرتا ہے کہ:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الحجرات ۱۰)

(مسلمان تو تمام کے تمام آپس میں بھائی بھائی ہیں پس ملا دو اپنے دو بھائیوں کو جب کبھی ان میں دوری پیدا ہو اور ڈرو اللہ سے شاید کہ تم پر رحم کیا جائے)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احادیث کے اندر مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا ہے اور ایک کو دوسرے کے دکھ درد میں کام آنے کی بڑی تاکید کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللَّهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [1]

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے چھوڑتا ہے۔ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آئے گا۔ اللہ اس کی ضرورت کے وقت اس کے کام آئے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی تکلیف کو دور کریگا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ستر پوشی کریگا اللہ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کریگا)

منو سمرتی تو یہ کہتی ہے کہ:۔

"شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے براہمن نرک میں جاتا ہے۔" (۳: ۱۷)

نیز یہ کہ:۔

"اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھائے تو تین دن تک روزہ رکھے۔ اور اگر جان بوجھ کے کھائے تو اس کا وہی کفارہ ادا کرنا چاہئے جو حیض، پیخانہ یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لئے مقرر ہے۔" (۴- ۲۲۲)

لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک جسم کے اعضاء کے مانند قرار دیتا ہے جس میں ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد تصور کرتا ہے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(مسلمانوں کی مثال، آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے، ایک دوسرے کا غم کھانے اور ایک دوسرے پر مہربانی کرنے میں جسم کے مانند ہے کہ اگر اس کا ایک حصہ تکلیف سے دوچار ہوتا ہے تو سارا جسم اسی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے اور بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

---

[1] مسلم جلد ۲ کتاب البر والصلۃ باب تحریم الظلم، ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب باب ... ترمذی جلد ۱ ابواب الحدود باب ما جاء فی الستر علی المسلم۔ [2] مسلم جلد ۲ کتاب البر والصلۃ باب تراحم المومنین [3] مسلم جلد ۲ حوالہ مذکور

المسلمون كرجل واحد ان اشتكى عينه اشتكى كله وان اشتكى رأسه اشتكى كله [1]

(سارے مسلمان ایک جسم کے مانند ہیں اگر اس کی آنکھ کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اس کے سر کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو پورا بدن اس تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے)

المؤمن مرآة المؤمن والمؤمن اخو المؤمن يكف عليه ضيعته ويحوطه من ورائه [2]

اسی طرح حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا ولا يحل لمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث ليال [3]

(مسلمانو! آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، اور پیٹھ نہ پھیرو، اللہ کے بندے آپس میں بھائی بھائی، کسی مسلمان کے لئے روا نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لئے چھوڑے رکھے)

قرآن و سنت کی یہ تصریحات ہر مسلمان کو اس بات کا دستوری حق فراہم کرتی ہیں کہ معاشرتی سطح پر اس کے ساتھ مساوات، برابری، اخوت و ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے اور واقعہ یہ ہے کہ آج تک اسلامی معاشرے میں یہ چیز کبھی ایک مسئلہ کی حیثیت سے ابھری ہی نہیں کہ اس کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے اور قانونی چارہ جوئی کی ضرورت پیش آئے۔ امت مسلمہ کے شب و روز شاہد ہیں کہ مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ اخوت و محبت، اور ہمدردی و مساوات کے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا محفوظ آستانہ ہے جہاں نا برابری کے جرائم آنے کے ساتھ ہی دم توڑنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔

---

[1] مسلم ج ۲ ۔ حوالہ مذکور [2] سنن ابی داؤد جلد ۲ ۔ کتاب الآداب باب النصیحۃ [3] سنن ابی داؤد جلد ۲ ۔ کتاب الادب باب الہجرۃ الرحمٰن ... بخاری باب ما ینہی عن التحاسد

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اقبال اور نژادِ نو

اقبال کے فکر و فن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی توجہ "کیا ہے" سے زیادہ "کیا ہونا چاہیے" پر مرکوز رہی ہے۔ حال سے بیزاری اور جہانِ تازہ کی تخلیق کے ذریعہ خوش آئند مستقبل کی آرزومندی و بشارت، ان کے فلسفۂ حیات کے ایسے موضوعات ہیں، جن کا ذکر ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ "آج" سے زیادہ "کل" کے یا حال سے زیادہ مستقبل کے شاعر ہیں اور اس میں ان کا خطاب بزرگوں اور ہم عمروں سے اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ نئی نسل سے ہے۔

قبل اس کے کہ "نژادِ نو" سے اقبال کے خطاب کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے پیغامِ حیات مختصراً سامنے کر دیا جائے۔ اسلئے کہ ان کا پیغامِ حیات ہی در اصل نئی نسل سے ان کے تعلق کو استوار کرتا ہے۔ اسمیں دو رائیں نہیں کہ اقبال ایک انقلابی مفکر شاعر تھے، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انقلاب کی کشمکش سے بھرپور زندگی، قوموں کی بقا و ارتقاء کی ضمانت اور انقلاب سے محروم زندگی موت کا پیغام دیتی ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

زندگی کا یہ ذوقِ انقلاب اقبال کے نزدیک کسی وقتی ہیجان یا جذباتی طوفان کا نہیں بلکہ ندرتِ فکر و عمل کا زائیدہ ہوتا ہے۔ یہ ندرتِ فکر و عمل جو اپنی دنیا آپ تخلیق کرکے اسے سنوارتی، سجاتی اور پروان چڑھاتی ہے، قوموں کے شباب و عروج سے عبارت ہے، اقبال کے لفظوں میں:

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب
غیرت کی حرارت، یہ تمنا، یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

یہ ذوقِ انقلاب یا ندرتِ فکر و عمل، انسان کی فطرت میں ازل سے موجود ہے۔ اس کی روح کو ظہور یا ثبات میں نہیں بلکہ تغیر و انقلاب میں قرار ملتا ہے۔ تغیر و انقلاب زندگی کی دائمی صفت ہے، اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں لیکن اس کی روح کبھی نہیں فنا ہوتی۔ اس روح کا دوسرا نام چراغِ مصطفوی کی پاکیزگی اور یزدانیت ہے، شرارِ بولہبی اور اہرمنیت سے دائم ستیزہ کاری اس کا مقدر ہے۔ جفا طلبی اور سخت کوشی

اور شعلہ مزاجی اور شور انگیزی اس کی سرشت میں ہے، وہ اس راز سے باخبر ہے کہ قوموں کی بقا سکون جوئی میں نہیں، کشمکش طلبی میں ہے، سکون و ثبات یا قیام اور ٹھہراؤ اس کی نگاہ میں فریب نظر اور موت کا پیش خیمہ ہے، سرگرم سفر رہنا، الجھ کر سلجھنا، سلجھ کر الجھنا اور تڑپنا، پھڑکنا اسے عجیب طرح کی لذت دیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ تازہ ہے شان وجود
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

یہ جدت فکر و عمل یا ذوق انقلاب، جس کی کارکشائیوں کا ذکر اقبال کے یہاں بار بار آتا ہے، ان کے اس عقیدے کا جزو لاینفک ہے کہ زندگی جامد و ساکت نہیں، نامیاتی اور حرکی ہے۔ اقبال کے لفظوں میں:

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے یہ زندگی ہاتھ نہیں آتی۔ اس کی تسخیر کیلئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اسکے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ حیات کسی ماحول سے مسلسل برسر پیکار رہا جائے، اس سے بیزاری کا اظہار کر کے اس سے مقاومت و مجادلت کی قوت پیدا کی جائے، لوگوں کو سود و زیاں کا احساس دلا کر اسکی سفاکیوں اور بوسیدگیوں کے خلاف دلوں میں گرمی پیدا کی جائے اور باطل کے مقابلے میں شان استغنا اور بے خوفی و بے جگری کے ساتھ ہمہ وقت حق کی تلوار کو بلند رکھا جائے۔ بقول اقبال

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
زندگی کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

لیکن ماحول و ماحضر سے بیزاری اور تصادم و پیکار کیلئے زور بازو یعنی قوت کی ضرورت ہے کیونکہ۔

"عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد"

چنانچہ اقبال نے اپنے فلسفۂ حیات میں بنیادی حیثیت قوت عمل ہی کو دی ہے، ان کا خیال ہے کہ صرف طاقتور ہی اپنے ماحول کی تخلیق کر سکتا ہے جبکہ کمزور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہوتا ہے۔ قوت میں یہ صفت ہے کہ وہ باطل کو چھو لیتی ہے تو باطل حق میں بدل جاتا ہے۔

(۱) اقبال نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ فلسفہ حق کی منطق ہے اور طاقت کا عمل ہے۔

(۲) انھوں نے اسرار خودی کے مغربی ناقدین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے نکلسن کو ایک خط میں لکھا تھا کہ میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں، اخلاقی حیثیت سے ضروری جانتا ہوں، اس لئے کہ زندگی کے مسائل کا حل قوت و حرارت دونوں کا محتاج ہے۔

(۳) اقبال کا خیال ہے کہ قوت، صفات الٰہیہ میں سے

ہے اور بندے کا فرض ہے کہ وہ خود کو اس صفت سے متصف کرے۔

(۴) اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ میں روحانی قوت کا قائل ہوں، جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا جب ایک قوم کی طرف سے حق و صداقت کی حمایت یا دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس عقیدے کی دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔

(۵) گویا اقبال کے نزدیک قوت کا سرچشمہ حق پر انسان کا یقین ہے، اقبال کا بیان ہے "جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے ایک نظریے پر کسی کو یقین آ گیا ہے تو اس نظریے کی صداقت پر اعتقاد بڑھ جاتا ہے۔

(۶) اقبال کے یہاں اس یقین کے کئی نام ہیں، جنون و عشق، درد و سوز، طلب و جستجو، ذوق و شوق، قلب و نظر، سب یقین کے مترادفات ہیں، یہی زندگی کو رواں دواں رکھتے ہیں۔ یہی انسان کو صفات الٰہیہ سے ہمکنار کر کے کلیم الٰہی کے منصب پر فائز کرتے ہیں، انھیں کی بدولت انسان بارگاہ ایزدی میں ادعائے خداوندی کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنے اوصاف کے تذکرے کی اس طور پر جرأت کرتا ہے۔

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

اور یہی یقین اپنی قوت تسخیر کے امکانات سے عرش و فرش میں لرزہ ڈال دیتا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

یقین یا عشق و جنون کی یہ کرشمہ سازیاں اور کارکشائیاں ممکن ہوتی ہیں اس سوزِ نفس یا شعورِ ذات کا جسے اقبال نے اپنے فلسفہ میں خودی کا نام دیا ہے۔

یہ سوزِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

ظاہر ہے اس تلوار کے دشمن اور اس کے متحمل و محافظ صرف نوجوان ہی ہو سکتے ہیں، ایسے نوجوان جن کا لہو گرم ہے جن کے بدن میں مدافعت کی قوت ہو، جن کی رگ و پے میں زندگی کا تازہ خون موجیں مار رہا ہو، جن کے سینے جوش و جوانی سے معمور ہوں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

جن کے دل زندہ اور جن کی روحیں عقابی ہوں، جن میں جھپٹنے، پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کا سلیقہ ہو جن کی ہمت مردانہ ستاروں پر کمند ڈال سکتی ہو، جن کا حوصلہ یزداں شکار اور غیور و جرار ہو جن کے جوشوں پر موت کے سامنے ہنسی کھیل رہی ہو، جن کی طبیعتیں خطر پسند اور جن کے ارادے بلند ہوں۔ جو فقر شبیری کو اپنا توشہ اور پہاڑوں کی چٹانوں کو اپنا نشیمن جانتے ہوں، جو اپنے اندر خودنگری، خودشکنی اور خودنگری کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جن کے زور بازو پر بھروسہ کر کے یہ کہا جا سکتا ہو کہ:

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ اقبال نے اپنے پیغام حیات یا فکر و فن میں۔ بالعموم نژاد نو یا نوجوانوں ہی کو خطاب کیا ہے۔ یوں بھی ان کا فلسفہ خودی جس میں قوت و عمل کو اساسی حیثیت حاصل ہے ان کی آخری عمر کا نہیں بلکہ عین عالم شباب کا تخلیق کردہ ہے ۱۹۱۰ء میں جبکہ ان کی عمر تیس اکتیس سال تھی، فلسفہ خودی کا ہیولیٰ وہ اپنے ذہن میں تیار کر چکے تھے یہ ہیولیٰ منظم شکل میں سات آٹھ سال بعد منظر عام پر آیا لیکن

اسی سے ذکاء ممکن نہیں کہ ان کی جوانی اور پختگی عمر کا پورا زمانہ جسے کسی فرد کے قوائے عمل کا بہترین دور کہہ سکتے ہیں فلسفۂ خودی کی تخلیق پر صرف ہوا۔ بقیہ زندگی اسی فلسفۂ خودی کی توضیح و تفسیر میں بسر ہوئی، مگر ایسے میں ان کے پیغامِ حیات اور اس کی تفسیر میں اور تحقیق کے ساتھ حرارت اور شبنم کے ساتھ شعلہ بھی نظر آئے تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اقبال کے فکر و فن کی اٹھان شروع ہی سے عہد گزرنے والی جوانی کے آثار لیے ہوئے تھی اور پتہ چلتا تھا کہ ان کے اصل مخاطب اور ان کی آرزو کے مرکز نوجوان ہی ہیں۔ انہی کے لئے بیج بو کر بھر دیا اپنے عہد سے بیزار اور مستقبل یعنی فردا و ترقی کا پیغمبر ... سے ہی پیامبر ہے۔

بچوں اور نوجوانوں سے اقبال کے گہرے تعلق کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بچوں اور نوجوانوں کے لئے کہی ہیں اور جو بانگِ درا کے حصۂ اوّل کی زینت ہیں۔ یہ نظمیں گویا اسی پیغامِ عشق کی تمہید ہیں جو اقبال نوجوانوں کو آئندہ دینا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ ان میں نئی نسل کی سیرت و کردار سازی کے لئے ترتیب و ترغیب کی روش اختیار کی گئی ہے جس پر چل کر کوئی شخص اپنی خودی کو استوار و مستحکم بنا سکتا ہے۔ ایک مکڑی اور مکھی کے عنوان کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ خوشامد و تملق میں آ جانا گویا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔

"پہاڑ اور گلہری" میں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ حقیقی بڑائی کا تعلق قد و قامت سے نہیں بلکہ حرکت و عمل سے ہے۔ "ایک گائے اور بکری" والی نظم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا وجود ساری مخلوق کے لئے باعثِ رحمت ہے۔

"بچے کی دعا" جس کا پہلا شعر ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

تعمیرِ شخصیت کے سلسلے میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ چھوٹے بڑے، عورت مرد، بوڑھے جوان سب کو ازبر ہے اور اس کا اثر سب ہی کے دلوں پر نقش ہے۔ "ماں کا خواب" ان نظموں میں سے ہے جس کا مقصود غیر ضروری سہارے اور رونے سے گریز ہوئی دنیا اور محیط کو فرد کی ترقی کی راہ میں ظاہر کرتا ہے۔ "پرندے کی فریاد" اخلاقی انداز میں غلامی سے بیزاری اور آزادی سے والہانہ لگاؤ کا اظہار بھی ہے اور ایک طرح کی ترغیب بھی۔ "ہمدردی" یعنی:

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

والی نظم صرف یہی نہیں ہے کہ ہمدردی کا درس دیتی ہے بلکہ ظلمت کو روشنی اور بدی کو نیکی میں بدل دینے کا عزم و حوصلہ بخشتی ہے۔ یہی وہ عزم و حوصلہ ہے جو آگے چل کر "شمع اور شاعر" کو یہ پیغام بخشتا ہے کہ:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اور یہی وہ عزم و حوصلہ ہے جو ان کے فلسفے میں آگے چل کر کہیں عشق و فقر کے نام سے پکارا گیا ہے اور کہیں سرمایۂ حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

جوانوں کے لئے ایسی دردمندانہ دعا شاید ہی کسی اور شاعر کے دل سے کبھی نکلی ہو۔ یہ دعا وہی ہے جو اقبال نے سفرِ انگلستان سے قبل حضرت محبوبِ الٰہی کے مزار پر اس طور پر مانگی تھی۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو

اقبال کی دعا قبول ہوئی اور وہ دور صحرا سے کسی کا سہارا لیے بغیر ابر کرم کی بدولت سایہ دار اور بار آور درخت بن گئے۔ سورج بنکر شہرت کے آسمان پر نمودار ہوئے اور آسمانوں اور ہم عصروں سے آگے نکل گئے نہ ان کے قلم نے کبھی کسی کا دل دکھایا نہ کسی کی شکایت کی۔ البتہ انکی آہ سحر گاہی سے دردمندوں کے دل چاک ہوگئے غلامی کی زنجیریں پگھلنے لگیں اور ملک و ملت کو انکی زندگی میں نہ سہی زندگی کے بعد ہی محکومی کے عذاب سے نجات مل گئی یہ حیات نو، یہ وہ حوصلہ ہے جسے اقبال نے نوجوانی میں اپنے لئے پسند کیا انکا معیار فکر و نظر کی توقع وہ نوجوانوں سے کرتے تھے بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ تخلیق و خلاقی کے منصب پر بھی اس سے دور جو سکا نئی نسل بھی کی تلافی کرے اور آج یہ ارمان لئے ہی تھم گئے کہ مستقبل اسلاف کے خوابوں کو صورت و عمل کا جامہ پہنائے۔

انکا یہ آرزو بھی شدید تھی اور دل میں کسی قدر گہری تھی اسکا اندازہ کرنے کیلئے ایک مختصر سا واقعہ کافی ہوگا ڈاکٹر جاوید اقبال کا بیان ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جب گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے ابا جان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی میں نے انہیں اردو میں ایک خط لکھا اور خواہش ظاہر کی جب واپس تشریف لائیں تو میرے لئے ایک گراموفون لیتے آئیں گراموفون تو وہ لیکر نہیں آئے لیکن میرا خط انکی مندرجہ ذیل نظم کی شان نزول کا باعث ضرور بنا۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھکو
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

نژاد نو سے اقبال کے تعلق اور اس کیلئے دعا کے سلسلے میں اس واقعہ سے روشن تر واقعات بھی موجود ہیں اس سلسلہ علامہ کی مشہور تصنیف "جاویدنامہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جاوید نامہ کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" کے نام سے ایک طویل دعائیہ نظم ہے۔ جاوید نامہ کی یہ دعائیہ نظم تقریباً ان تمام رموز و نکات کا احاطہ کرتی ہے جو اقبال نوجوانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ البتہ یہاں ایک سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ آخر اقبال نے "جاویدنامہ" ہی کو جاوید سے یا نژاد نو سے منسوب کرنا کیوں پسند کیا اسکا ایک سبب تو خود جاویدنامہ کا موضوع ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ فلک مشتری اور فلک زحل کی سیر کی ہے۔ وہ افلاک یعنی آسمانوں سے پرے اس طرف پہنچے ہیں اور فرشتوں سے آگے گزر کر ماورائے کائنات کے حقائق سے آشنا ہوئے ہیں ان حقائق کو دور رس نگاہ [illegible] پہنچانا انکی زندگی کا مقصد تھا لیکن اقبال کی روشن ضمیری اور شعور باطنی نے انہیں بتا دیا تھا کہ انکی تفہیم و تحسین یا ان تک رسائی ان کے ہم عصروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان حقائق سے آگہی کی ذہنی صلاحیت [illegible] انکا مطلب اٹھا سکے گی [illegible] سے تعلق ہو سکتے ہیں اور [illegible] انکی تشنگی [illegible] سے سکتے ہیں [illegible]

[illegible] کا ترجمہ [illegible] ذریعہ جاوید [illegible] اور سمجھتے ہوں گے سمجھتے کہ یہ لوگ وہی ہوسکتے ہیں جو اقبال کے بعد آنے والی نسل یعنی نژاد نو سے تعلق رکھتے اور جن کے ہاتھوں پرورش پاکر ماہ و مریخ وغیرہ آدمی کے مسکن بن گئے انکا لئے اقبال نے اپنے شعری مجموعوں میں جاویدنامہ کو اس مرتبہ کی تصنیف بناکر اسے جاوید کے حوالے سے

فرزاد نو کے نام سے معنون کیا ورنہ اور بھی کتابیں تھیں جن کا انتساب وہ جاوید کے نام سے کر سکتے تھے ۔

ضرب کلیم میں بھی اسی قسم کی ایک لمبی نظم چھوٹی بحر میں ملتی ہے ۔ اس میں بھی اگرچہ اقبال کا خطاب جاوید سے ہے لیکن اس تخاطب کا اطلاق درحقیقت پوری نسل پر ہوتا ہے ۔ مواعظ و مطالب کی روشنی دینی ہیں زیادہ ہے بجز کہ وہاں فارسی میں گفتگو تھی یہاں اردو میں ہے ۔ اسلوب اور لہجہ بھی جاوید نامہ کی طرح پرشکوہ و بلند آہنگ نہیں بلکہ سادہ و دلنشیں ہے اقبال نئی نسل کو کن کن خصوصیات کا حامل بنانا چاہتے تھے یا ایک مثالی نوجوان کی تصویر ان کے ذہن میں کیا تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے ضرب کلیم کی مشہور نظم "محراب گل افغان کے افکار" کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔ اس نظم کے مختلف اجزاء مختلف بحروں میں ہیں اور محراب گل افغان کے فرزند کو مختلف طرح طرح کی نصیحتیں کی ہیں اس نظم کا دسواں جزو ایسا ہے جس میں اقبال کے خیالی نوجوان کی تصویر بہت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے صرف پانچ اشعار ہیں ۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں اگر اس کا سوز ہے ہمہ ساز
کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

اقبال کے بیان فرزند کہستانی یا فرزاد نو کا ایک اور نام بھی ہے اور وہ ہے "شاہین" بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اقبال نے اپنے کلام میں اپنے مثالی نوجوان کو عموماً اسی نام سے پکارا ہے اس لئے کہ ایک نوجوان وہ جس قسم کے مردانہ اوصاف دیکھنے کے آرزو مند تھے وہ انہیں شاہین میں نظر آتے ہیں اقبال نے خود ایک جگہ بیان کیا ہے کہ "شاہین" کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔ خوددار و غیرت مند ہے اور کسی کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا ۔ بے تعلق ہے آشیانہ نہیں بناتا ۔ بلند پرواز خلوت پسند ہے اور تیز نگاہ ہے چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین اور اس کی صفات کا ذکر کیا ہے لیکن اس ذکر سے انکی مراد نوجوان ہی کے سیرت و کردار سے ہے ۔ چند اشعار دیکھئے ۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آ ۔ ۔ اور بھی ہیں

[illegible] ذوق شاہینی پر تبصرہ [illegible]

۱۔ اس فلسفۂ اقبال پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو [illegible] جارحیت، رہبانیت کی تعلیم دیتے رہے ہیں حالانکہ یہ بات جاننے والے جانتے ہیں کہ اقبال کا فلسفۂ حیات جس میں اخوت، محبت، احترام آدمیت، ضبطِ نفس، گدازِ قلب، پابندیٔ آئین اور فقر و قلندری پر سب سے زور دیا گیا ہے، کسی دوسرے کا پیغام نہیں ہو سکتا جو سوائے دفاع کے سوا کسی کی جانب جارحانہ قدم اٹھانے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ شاہین کی تشبیہ انھوں نے مسلمان نوجوان کیلئے ضرور استعمال کی ہے لیکن اگر کلامِ اقبال کا تاریخ وار مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ تشبیہ بھی ان کے فکر و فن کی طرح ارتقا کی صورت رکھتی ہے۔ یہ تشبیہ پہلے پہل بانگِ درا کے حصہ سوم یا آخری حصے یعنی ۱۹۰۸ء کے بعد کے کلام میں نظر آتی ہے۔ پھر کثرتِ استعمال اور تکرار کے ذریعہ ارتقا کی ایسی منزل میں پہنچ گئی ہے جہاں اقبال کا فلسفۂ حیات کسی خاص علاقہ، وطن، ملت تک محدود نہیں رہا بلکہ ساری دنیا کیلئے امن و آشتی اور دوستی و صلح کا پیغام بن گیا ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل میں اقبال کی نظم "شاہین" اسی کی تکمیل کی ہے۔ اس میں خود شاہین نے اپنی زبان سے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ اسلامی جارحیت نہیں ہے بلکہ جارحیت دشمن ہے اور ایسی بے نیاز درویشی جس کا تعلق رہبانیت سے نہیں بلکہ اسلامی سپرٹ سے ہے:

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

مثنویوں کے ذکر میں ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنی بیشتر مثنویاں مولانا روم کی مثنویوں کے وزن پر لکھی ہیں۔ یہاں تک جن کا ذکر ہے مولانا روم اور علامہ اقبال میں چند مماثلتیں ہیں۔ جن کا ذکر اختصار کے ساتھ یہاں ضروری ہے:

۱۔ علامہ اور مولانا دونوں مثنویوں میں افسانے اور اخلاقی قصے شامل کر لیتے ہیں۔

۲۔ مولانا روم کلامِ ربانی سے اکثر اقتباسات بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں یہی حال علامہ اقبال کا ہے۔

۳۔ دونوں شعراء مکالموں کے ذریعہ ڈرامائی تاثر پیدا کرتے ہیں۔

۴۔ دونوں شعراء سنائی اور عطار کے بڑے مداح ہیں اور ان کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ اب ہمارے لئے جاننا ضروری ہے کہ ان دونوں شعراء کے طرزِ بیان میں اس قدر یگانگت کیوں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ علامہ فلسفۂ مغرب کے بہت بڑے مفکر تھے۔ انھوں نے جب مولانا کا مطالعہ کیا تو ان سے بڑی حد تک متاثر ہوئے جس کا جگہ جگہ اعتراف موجود ہے۔ علامہ یورپ جانے سے قبل سیالکوٹ میں اپنے گھر میں مثنوی شریف پڑھا کرتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ علامہ مرحوم مثنوی شریف کی گہرائیوں سے عنفوانِ شباب ہی میں واقف ہو گئے تھے۔ ان فرقوں مثنویوں نے ان کو آخر وقت تک نہ چھوڑا۔

روم اور اقبال کے نزدیک عشق ایک نہایت موثر [illegible] جس قدر ذوق اور شوق کے ساتھ دونوں شعراء عشق کا عمل [illegible] زندگی میں کارفرما سمجھتے ہیں اس کو دونوں نے اکثر اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ اس کی مثالیں دوسرے شعراء میں کم ملتی ہیں علامہ فرماتے ہیں:

ہر اسے عشق اسے رمزِ دل [illegible]
کہن گشتند [illegible] خاکی نہادان
بیا اسے کشته دل را [illegible] حاصل ما
دگر آدم [illegible] کن از گل ما

ایک دوسری رباعی میں علامہ فرماتے ہیں

(۱) بہ رنگ لالہ رنگ آمیزئ عشق

(۲) اگر [illegible] را [illegible]

(۳) [illegible] انگیزئ [illegible] مستی

[illegible] مستی و [illegible] عشق

اس کے متعلق مولانا رومی کے یہاں ارشادات بکثرت ملتے ہیں مگر ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

جو کام مولانا رومی پر ہند و پاکستان میں ہوا ہے مولانا سید عبداللہ نے اس کی تقسیم پانچ ادوار میں کی ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دوسرا دور: اس دور میں بھی مولانا رومی پر ہند و پاکستان میں بہت کام ہوا ہے۔ اس کا ایک بڑا نشان عبد اللطیف گجراتی کی لطائف معنوی شرح مثنوی ہے جو ایک مرکز الآرا تصنیف ہے۔

چوتھا دور: اس دور میں مولانا پر بہت کام ہوا ہے اور اسی دور میں خوارزمی کی جواہر الاسرار شائع ہوئی ہے اور اس کا بڑا کارنامہ ہے۔

تیسرا دور: یہ دور اصل میں [illegible] عہد فاروقی سے شروع ہوا اور آخر میں [illegible] جاری رہا۔ اس دور کا ایک [illegible] کارنامہ مولانا بحر العلوم کی شرح کی تکمیل ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہو گیا اور اس کے لیے مولانا بحر العلوم پر [illegible] ستائش کے مستحق ہیں۔

چوتھا دور: اس دور میں ایک بہت بڑا کام مولانا شبلی نعمانی کی سوانح مولانا روم ہے۔

پانچواں دور: یہ دور علامہ اقبال کی شاعری کا ہے جس نے علامہ کے ہندوستان کو گویا معروف کر دیا۔

تیسرے دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زبان ہی ہندوستان پاکستان کی نہیں بلکہ یورپ سے اور یہاں بھی بہت کثرت سے کام ہوا۔ انگلستان اور جرمنی میں بھی [illegible]

تو مولانا رومی پر کام کی ابتدا انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہو گئی تھی لیکن یہ کام موجودہ صدی کے ابتدا میں بھی بڑی شان سے جاری رہا۔

[illegible] سے پہلے دفتر کا [illegible] نے ۱۹۷۶ء میں بڑی شان سے شائع کیا۔ [illegible] دیوان شمس تبریز کا [illegible] نہایت [illegible] کے ساتھ شائع کیا۔

اس زمانہ میں جب یہ تمام کام ہند و پاکستان میں ہو رہے تھے تو انگریزی زبان میں رینالڈ نکلسن نے بڑی [illegible] کتاب [illegible] سے شائع کی [illegible] ۱۸۹۸ء [illegible] دیوان شمس تبریز کا ترجمہ ترتیب اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اور اس ترجمہ کی اشاعت کے بعد اس عظیم نقش نے ۱۹۲۵ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصہ میں پوری مثنوی کا ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی کی مدد سے نہایت ترتیب و تہذیب کے ساتھ شائع کر دیا۔ اسی زمانہ میں پروفیسر آربری نے فیہ ما فیہ کا ترجمہ اور چھوٹی چھوٹی نظموں کا ترجمہ بھی شائع کر دیا۔

یورپ اور پاک و ہند میں جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو ایران میں بدیع الزمان فروزانفر نے ایک مستند سوانح ۱۳۱۵ھ میں شائع کی اور [illegible] دیوان شمس تبریز [illegible] بھی بڑا کام انجام دیا۔

اس کے تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی فریدون بن احمد سپہ سالار کی [illegible] کتاب احوال مولانا جلال الدین ۱۳۲۵ھ میں شائع ہوئی۔ ہند و پاکستان میں اس زمانے میں بھی [illegible] مولانا رومی پر کام سے غافل نہیں رہے۔ ان میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولوی [illegible] اور خلیفہ عبد الحکیم کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔ جہاں [illegible] انقلاب [illegible] ہو رہا تھا وہاں اسی زمانہ میں مولانا [illegible] پوری مثنوی کا ترجمہ شائع کر دیا۔

[illegible] مختصر [illegible] مولانا رومی پر کام کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ [illegible] ہندوستان [illegible] کے علما کو [illegible]

بقیہ [illegible]

عالم اسلام

مجاہدین افغان

کامیابی کی راہ پر

کئی سال گزرنے کے بعد بھی روس کے ناپاک وجود سے افغانستان کی سرزمین خالی نہ ہو سکی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل ہو یا اس کی طرف سے چوٹی کانفرنس ہو یا ہندوستان میں منعقدہ حالیہ ناوابستہ سربراہ کانفرنس ہو کوئی بھی اس ریچھ کو اور من مانی پر پابندی کا در لگا سکا۔ افغان مجاہدین کی ہمت اور بے سروسامانی کے عالم میں ان کی بہادری کی داد دینا بھی انصاف نہیں ہے۔ پوری اسلامی برادری اور ناوابستہ ممالک کو یک زبان ہو کر روس سے یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ ہلاکت اور خون کا یہ کھیل بند کرے اور افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلا لے۔ اور انکار کی صورت میں اس پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا جانا چاہیے۔

ادھر خبر ملی ہے کہ مجاہدین نے اپنی شجاعت اور جان فروشی کے عوض افغانستان کے دوسرے بڑے شہر خاکریز پر اپنا قبضہ بحال کر لیا ہے۔ اس شکست سے خفت سے بچنے کر روسی فوجوں نے انتقامی کارروائیاں شروع کر دی ہیں اور خاکریز کے قرب و جوار کے دیہاتوں کو اپنے ظلم کا ہدف بنایا ہے۔ دریں اثنا مجاہدین نے روس کی فوجوں سے قندھار اور ہرات کے علاقے میں سخت مورچے لیا ہے اور ان حالیہ جھڑپوں میں کئی روسی فوجی افسران بھی کام آئے ہیں معتبر ذرائع سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ کرمل حکومت نے اس پسپائی سے جھنجھلا کر روسی تربیت کی افغان بچوں کی جبری بھرتی کی اسکیم بھی شروع کر رکھی ہے۔ اواخر مارچ میں اسی اسکیم کے تحت جمعہ کی نماز کو جاتے ہوئے ۱۳، ۱۴ سالہ بچوں کو بھی پکڑ لیا گیا تھا۔ یہ اسکیم خوف و ہراس پیدا کرنے کے علاوہ اس خلا کو پر کرنے کے لئے شروع کی گئی تھی جو گزشتہ چند ماہ کے دوران روسی فوج میں شامل افغان سپاہیوں کے مجاہدین کے کیمپ میں شامل ہونے سے پیدا ہو گیا تھا۔ مجاہدین نے اپنے مسلسل چھاپوں سے کابل کو تقریباً پاور اسٹیشنوں سے منقطع کر دیا ہے جس سے شہر میں بھی بجلی کا نظام بری طرح متاثر ہے۔

پاکستان تیس لاکھ افغان پناہ گزینوں کی کفالت کا بار بڑی فراخدلی اور جذبۂ اخوت کے تحت برداشت کر رہا ہے مگر ملک کی معاشیات کا خیال کر کے تو وہ اس مسئلے کو جلد حل کرنا چاہتا ہے۔ ان دنوں جنیوا میں

کرمل حکومت کے وزیر خارجہ اور پاکستانی وزیر خارجہ کے درمیان پناہ گزینوں کے مسئلے کے منصفانہ حل پر مذاکرات چل رہے ہیں۔ خدا کرے یہ مذاکرات کامیابی کے ساتھ ختم ہوں۔ اس کا ایک ہی منصفانہ حل ہے کہ روس افغانستان خالی کر دے اور افغانی عوام کو باعزت اپنے ملک کی سرحدوں میں واپس آ کر اپنی نمائندہ حکومت قائم کرنے کی اجازت دے

عرب ممالک کا سات نفری وفد جب پچھلے دنوں روس گیا تھا تو لبنان اور فلسطین کے سوا روسی حکمرانوں سے افغانستان کے مسئلہ کوئی واضح بات نہیں کی پھر بھی کامیابی کی خوش فہمی لیے ہوئے تھے۔ کاش کہ اس کو بھی مسئلہ فلسطین کی اہمیت دی جاتی ورنہ ایک روز کابل بھی بیروت کا نقشہ پیش کرے گا۔ ان دنوں امریکہ سے بیزاری اور روس کی طرف میلان بڑھتا جا رہا ہے۔

اسرائیلی جارحیت کا ایک نیا باب

عرب ممالک مشرق وسطیٰ میں بحالی امن کے لیے مختلف سطح پر مذاکرات اور گفت و شنید میں مصروف ہیں۔ کئی مسائل ہیں اور کسی کا بھی حل کانفرنسوں سے نہ نکل سکا۔ ادھر اسرائیل ان سرگرمیوں سے بے پرواہ اپنی سازشوں کو عملی شکل دیتا جا رہا ہے۔ جس وقت ہم کانفرنسوں میں مصروف ہوتے ہیں اسرائیل اسے اپنے لیے فرصت سمجھتا ہے اور کسی نئی جارحیت سے ہم کو بوکھلا کر رکھ دیتا ہے

پچھلے دنوں ان درندوں نے فلسطینی عوام پر سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ایک اور قیامت ڈھائی۔ یوم فلسطین کے موقع پر طالبات کے جلوس پر زہریلی گیس کا استعمال کر کے اسرائیل نے انسانیت کو ایک بار پھر شرمسار کر دیا ہے۔ جوش و وطنیت سے سرشار طالبات کا یہ جلوس بیگن حکومت کی سختیوں اور توسیع پسندی کے خلاف جنین کے علاقے میں مظاہرہ کر رہا تھا۔ محرومی اور بے وطنی کا احساس واقعہ لبنان کے بعد اس وقت اور بڑھ گیا جب اسرائیل نے مقبوضہ مغربی کنارہ اور غازہ کی پٹی میں نو آبادی بستیوں کی تعمیر کا منصوبہ شروع کیا اور جس کے تحت کوئی ایک لاکھ مکانات تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ مظاہرین پر زہریلی گیس کے استعمال سے جہاں ان کو ختم کر دینا مقصود تھا وہیں طبی رپورٹوں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان بچیوں کو مستقبل کی ماں بننے کی صلاحیت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دہری نسل کشی کی اسکیم کو مکمل کیا گیا ہے۔ صبرا اور شتیلا میں جو کچھ ہوا تھا اسی کا ایک سین یہاں بھی دہرایا گیا ہے۔ صرف انداز بدلا ہوا ہے۔ امریکہ کے مسلسل دلاسوں اور روس کی شاطرانہ ہمدردی کے برعکس اسرائیلی جارحیت میں کوئی کمی نہیں آ رہی ہے۔ ۱۹۴۸ء سے برابر وہ اپنی ان مذموم کوششوں میں مصروف ہے۔ امریکہ کے نہ چاہتے ہوئے بھی اسرائیل کی یہ تب و تاب کہ وہ صدر ریگن کے امن فارمولے کو یکسر مسترد کر دے۔ ان کے بھیجے ہوئے نمائندوں فلپ حبیب اور ڈریپر کی صلح کی کوششوں کے علی الرغم نئی اسکیموں کو عملی شکل دیتا رہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امریکہ عربوں کو زبانی ہمدردی اور اسرائیل کی حرکتوں پر ظاہری ناراضگی ظاہر کر کے خوش کرتا رہے۔ اور اسرائیل کو اس کا کام کرنے کی مہلت دیتا رہے۔

ابھی اس المیہ کی بازگشت سے فضا گونج ہی رہی تھی کہ دوسرا

سازش ہوئی بھی عملی شکل دے دی گئی۔ مقبوضہ فلسطین میں تعلیمات: اسرائیلی حکام نے تقریباً ۴۸ ان تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جن میں فلسطینی بچے اور بچیاں زیر تعلیم تھیں۔ اس سے ۲۹۵۸۰ طلباء و طالبات کا تعلیمی نقصان ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی ۱۶ ہزار فلسطینی بچوں کو سرکاری اسکولوں سے خارج کیا جا چکا ہے گویا کہ ہر طرف سے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔

اور اس ہفتہ پی ایل او کی سیاسی ونگ "الفتح" کے سرگرم کارکن اور یاسر عرفات کے سیاسی مشیر ڈاکٹر عصام سرطاوی کو اس وقت پرتگال میں قتل کر دیا گیا جبکہ وہ بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس میں شرکت کے لئے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس قتل کے پیچھے یقیناً اسرائیل کی خفیہ تنظیم "الموساد" کا ہاتھ ہے۔ چند قرائن ایسے ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر سرطاوی کو کانفرنس میں شرکت کا باقاعدہ دعوت نامہ ملا تھا مگر وہاں پہونچنے کے بعد مستقل ممبر کی حیثیت سے انہیں شرکت سے روک دیا گیا اور پھر کسی طرح مشاہد کی حیثیت سے شرکت کی اجازت دی گئی۔ دوسری بات یہ کہ جس ہوٹل میں ان کے قیام کے انتظامات تھے وہاں کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ایسی اہم اور معتبر شخصیت جس ہوٹل میں ٹھہری تھی اس کے احاطہ میں پولیس کی تعیناتی نہیں تھی اور یہی وجہ ہے کہ قاتل تنہا تھا اور اسے فرار ہونے میں کامیابی ہوئی۔ بہرحال پچھلے ایک سال میں تنظیم آزادی فلسطین سے وابستہ یا اس کے کاز سے ہمدردی رکھنے والی اہم شخصیتوں کا دسواں قتل ہے۔

اسرائیل تجربہ کار جنگجوؤں سے نہ صرف یہ کہ باز نہیں آرہا ہے بلکہ فلسطین اور لبنان کے علاقوں کو خالی کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی بیت المقدس کے انہدام کی کوششیں بھی جاری ہیں پھر بھی ہماری آنکھ نہیں کھلتی۔ گھر کے تنازعات سے فرصت نہیں۔ خاص کر ایسے موقعوں پر عربوں کی رواج خاموشی پر رونا بھی آتا ہے۔ کئی طوفان سر سے گذر گئے مگر شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبا کر ایسے پرسکون ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اگلی عرب چوٹی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ ع

کہ غیرت بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

جمعیت [illegible] کا

نمایاں سے بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہاں ہندو پاکستان کے علماء بھی اپنے کا بساط نمایاں سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔

نکتہ دانی المعنی را در ارم
گفت رومی اے سخن را جان نگار
صحبت افتاد با پیر ارم
تو کہ گفتی سید رسی ریز دان نگار
شاعر کہ بگرد آن عالی جناب
داند آن کو نیک بخت و محرم است
نیست پیغمبر و لے دارد کتاب
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

بقیہ ص ۴۳ کا

لوم کی دسترس سے باہر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک پیغمبر اور مصطفیٰ سے پہنچائی ہیں۔ انہیں وہ بالکل ثابت ہونا ہے کچھ ثابت ہو جائیں کہ پتہ جائیں گی اور نوح کی کشتی کا راز بھی منہ ورق سے پہلے جو انسانی تاریخ میں عنقریب الٹ کر سامنے اور انکار کرنے والے پھر کسی اور چیز کا بہانہ تلاش کر کے انکار کرتے رہیں گے۔

سعد بن اسعد

جس کی خبر خود اللہ نے دی ہے،

جس کا ذکر اب تک تاریخ کی کتابوں میں محفوظ تھا

ایک چونکا دینے والا انکشاف! اسے اب آنکھیں دیکھ بھی سکیں گی

نوحؑ کی کشتی

زمان و مکان کا تلاطم بارہا ایسے واقعات کو اچھال کر سامنے لے آتا ہے جو ہمارے لئے صرف یادوں یا کہانیوں کی صورت اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ جب کوئی سائنسی توجیہ یا اتفاقی تشریح سامنے آجاتی ہے تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ زمان خانوں میں چھپی یہ وارداتیں سچ ثابت ہو گئیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم وہ واقعات ہیں جو قرآن میں بیان ہو چکا ہے لیکن ہم نے کبھی ان پر تحقیق کرنا مناسب ہی نہیں سمجھا۔ لوگ قصص القرآن کو پڑھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ آج صدی کے اوائل میں جب دریائے نیل کے قریب ایک فرد کی تجربے کی کھدائی کے دوران ایک ایسے بادشاہ کی لاش دریافت ہوئی کہ جس پر نمک کی تہہ چڑھی ہوئی تھی تو سائنسدانوں کی رگ تحقیق پھڑکی کہ کہیں یہ فرعون تو نہیں جس کا ذکر قرآن کیا گیا ہے کہ اس نے سمندر میں ڈوبنے سے پہلے خدا سے توبہ کی اجازت چاہی تھی۔ سائنسی تجربات نے یہ ثابت کیا کہ یہ لاش تین ہزار سال پرانی ہے۔ اور سمندر میں ڈوبی رہی ہے جسم نے سمندر کا نمک جذب کر لیا وہ صدیوں کے عمل میں دوبارہ

ابھر آیا اس طرح کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن پر تاریخ انسانی شاید مستقبل میں پردہ اٹھائے گی۔ یوں لگتا ہے کارکنان قضا و قدر صرف وقت کا تعین کرتے ہیں کہ کس کو کب سامنے لانا ہے جیسے جیسے یہ بھید کھلتے رہیں گے ویسے ویسے انسانیت اسلام کی طرف مائل ہوتی رہے گی کہ وہ زمانہ آئے گا جب کوئی انکار کرنے والا نہیں رہے گا۔ مگر وہ زمانہ بھی قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے قصص القرآن میں سے ایک واقعہ جس کا کلام مجید میں کئی دفعہ ذکر آیا ہے نوحؑ کی کشتی سے متعلق ہے۔ مختصراً یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کہ جنہوں نے ایک ہزار پچاس برس عمر پائی اور تقریباً ساری زندگی (نو سو پچاس برس) اللہ کے دین کی تبلیغ و ترویج و ترغیب میں مصروف رہے مگر اس کے باوجود ان کے ہم عصر گمراہی کی دلدل میں گرتے ہی چلے گئے کہ حضرت نوحؑ مایوس ہو گئے۔ جب انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کی قوم میں خیر کا پہلو ختم ہو گیا ہے اور شر کی قوت اپنی پوری قوت سے سرکشی پر آمادہ رہی۔ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ

نے یہ علم دیا کہ اب اس قوم پر خدا کی حجت تمام ہو گئی ہے اور ان کے عذاب کے نازل ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ چنانچہ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ایک ایسی کشتی تیار کریں جس میں ہدایت یافتہ چند افراد اور ہر جانور کا ایک ایک جوڑا رکھ دیا جائے کیونکہ اللہ اس قوم پر پانی کا ایک سیلاب و عذاب بھیجنا چاہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں گمراہ لوگ فنا ہو جائیں اور پھر اس کے بعد انسانیت کا سفر دوبارہ شروع کیا جائے۔ چنانچہ گمراہ لوگوں نے دیکھا کہ جن دھوپ میں اور پہاڑوں کے دامن میں حضرت نوحؑ ایک ایسی طویل و عریض کشتی بنانے میں مصروف ہو گئے جس کے کھینے جانے کے اس علاقے میں امکانات ہی نہیں تھے وہ کام میں مصروف حضرت نوحؑ کے پاس آتے اور مذاق اڑاتے کہ یہ شخص اس عالم میں کہ بارش کا کوئی امکان نہیں اور اس علاقے میں کہ جہاں سیلاب آنے کا سوال ہی نہیں؟ کشتی بنا رہا ہے۔ مگر حضرت نوحؑ اس کے باوجود اپنے کام میں مصروف رہے حتیٰ کہ کشتی مکمل ہو گئی اور کشتی کے مکمل ہوتے ہی اس گمراہ قوم اور ان سرکش انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت بھی تمام ہو گئی اس کے ساتھ آسمان اور زمین سے پانی پھوٹ پڑا اور آسمان سے سیلاب برسنے لگا۔ ایک خدا کے برگزیدہ بندے کی نو سو پچاس برس کی محنت اکارت چلے جانے پر خدا کا ایسا عذاب نازل ہوا جس کی مثال ملنی مشکل ہے اور بائبل کے عہد نامہ عتیق میں درج ہے کہ چالیس دن آسمان برستا رہا اور زمین پانی اگلتی رہی حتیٰ کہ تمام موجودات زمین اس میں ڈوب گئی اور جن میں نوح کا بیٹا سرکش قوموں بلکہ پہاڑ تک شامل تھے۔ کرۂ ارض پر ہر طرف پانی پھیلا ہوا تھا۔ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سوائے حضرت نوحؑ کی کشتی کے کہیں پناہ نہیں تھی۔ وہ سارے جنہوں نے خدا بھی اور بہت سے جھوٹے جھوٹے اور لغو میں نوح کی قوم اللہ کے ساتھ شریک کر رکھی تھی — اس سیلاب عظیم میں حقیر کیڑوں کی طرح ڈوب گئے۔ وہ چند لوگ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے تھے اور جانوروں کے جوڑے محفوظ رہے۔ باقی ہوتے فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ حضرت نوحؑ نے دعا کی اور وہ کشتی جو پر آب تیرتی رہی۔ حتیٰ کہ جب اس کرۂ ارض سے انکار کرنے والوں کا خاتمہ ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: "اے آسمان تھم جا اور اے زمین پانی نگل جا"۔ اور پھر آسمان سے پانی برسنا تھم گیا اور زمین پانی نگل لیا۔ اور حضرت نوحؑ کی کشتی ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا ٹھہری۔ ایک ایسی چوٹی پر جہاں عام حالات میں کسی ایسی کشتی کا لے جانا، کھڑا کرنا اور ٹکا دینا، انسانی قوت کے بس میں نہیں — یہ وہ مختصر معلومات ہیں جو ہمیں قرآن بتاتا ہے۔ مگر اس کی موجودہ جگہ کے بارے میں تاریخ چپ ہے۔

آج کہیں حضرت نوحؑ کی کشتی ہے بھی یا نہیں، اگر ہے تو کہاں ہے، کیا وہ زمانے کے ہاتھوں بچی رہی ہے یا نہیں ایسے بہت سے سوالات ہیں جو ذہن میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ قیاس آرائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں تک اس واقعے کے وجود کا تعلق ہے۔ اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں مگر اس راز کے کھلنے میں وقت لگ جاتا ہے جو روح کائنات کے اپنے انتظام کا مرہون منت ہے۔ ظاہر ہے وہ کشتی کوئی معمولی یا چھوٹی کشتی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں جانوروں کا ایک ایک جوڑا موجود تھا اور پھر یہ چونکہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہری تھی اس لیے کہیں برف میں دبی ہوئی ہوگی۔ مسلم روایات کے مطابق جودی پہاڑ کی چوٹی ہے۔ کچھ دوسری روایات ارارات سامنے آئی ہیں۔ گذشتہ تقریباً عشرہ بھر سے یہ شبہ زور پکڑ گیا ہے کہ وہ کشتی کوہ ارارات جو ترکی اور روس کی سرحد پہ واقع ہے، وہاں موجود برف میں دبی پڑی ہے۔ اسے وہاں سے نکالنے، اس کے بارے میں تحقیق کرنے اور دنیا کے سامنے کچھ حقیقتوں کو لانے میں سیاسی عوامل ہیں۔ ترکی اور روس کی سرحد پر ان دونوں کے درمیان تو تو میں میں کے تعلقات کے عدم وجود کی بنا پر حقیقت سے پردہ اٹھانے کی اقدامات ہیں۔ ارارات کے ساتھ چودہ ہزار فٹ کے فاصلے میں برف میں دبی ہوئی ہے

ہے جو جغرافیائی لحاظ سے روس اور ترکی دونوں کے لئے بہت اہم ہے مگر کئی امریکی اور تاریخی تحقیق دان جو کوہ ارارات کے ذریعے تاریخ کو ثابت کرتے ہیں اس امر میں دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر ارارات پر کوئی کشتی ملی تو اس کی موجودگی اور تاریخ کا تعین کیا جائے۔ اگر ایک دفعہ وہ کشتی دریافت ہو گئی تو اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں اور ایسے کیمیائی عمل موجود ہیں جن کے ذریعے کسی بھی پرانی شے کی عمر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ارارات پر حضرت نوحؑ کی کشتی کے بارے میں پہلے اپریل ۱۹۱۶ء میں بازگشت سنائی دی۔ جب ایک روسی پائلیٹ جو اس علاقے پر پرواز کر رہا تھا۔ اس نے برف میں دبی کشتی کا ڈھانچہ دیکھا۔ اس نے پرواز کے اختتام پر اپنے بیس پر پہنچ کر اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع دی کیونکہ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ پہاڑ کی اس بلندی پر اتنی بڑی کشتی کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا مذاق اڑایا مگر وہ پائلیٹ اپنی بات پر اڑا رہا حتیٰ کہ اپنے سٹیشن کمانڈر کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اس وقت کے زار روس جو آخری روسی زار تھا تک یہ بات پہنچائی گئی اس کے احکامات پر ایک سو پچاس سپاہیوں، فوجیوں اور … والوں پر مشتمل ایک ٹیم ترتیب دی گئی جس کے ذریعے وہ ارارات پر پہنچ کر اس سارے قصے کا کھوج لگانا مقصود تھا کہ تصویریں اور دوسرے ڈاکومنٹ لائے جائیں اور اس کشتی کی حقیقت سے پردہ اٹھایا جا سکے ...... مگر اس مہم کا سارا تحقیقی خزانہ بالشویک انقلاب کے دوران میں ضائع ہو گیا۔ یہ بات غور طلب ہے کہ اگر اس وقت کی حکومت کو اس پائلیٹ کی بات اور بیان کا یقین نہ ہوتا تو کبھی ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل ٹیم اس کشتی کی تحقیق کے لئے بھیجی نہ جاتی۔

اس کشتی کے بارے میں دوسرا واقعہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے … جیکب گیکیرین جس کی عمر اس وقت … برس تھی۔ اور جو … تھا، اپنے والد کے ساتھ پہاڑی مہم کے دوران ارارات کی چوٹی تک جا پہنچا۔ جس نے کشتی کا وہ حصہ چھو کر دیکھا جو برف سے باہر ہے ۔ جیکب گیکیرین کا کہنا ہے۔ اس کے والد نے یہ کہہ کر سفر شروع کیا تھا کہ وہ اسے ایک نہایت مقدس اور نایاب چیز دکھانے لے جا رہا ہے۔ ان کا گھر اس پہاڑ کے دامن میں تھا۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ اس علاقے کے لوگ بھی اس کشتی کی موجودگی سے باخبر تھے کیونکہ چوٹی کا راستہ عام انسانوں کے لئے ناقابلِ عبور ہے۔ جیکب گیکیرین جو امریکہ میں قیام پذیر ہے پچھلے چند سالوں میں جب اس سے امریکہ میں رابطہ قائم کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے والد کے ساتھ صبح کاذب کے وقت سفر شروع کیا تھا اور سات دن کی مشقت کے بعد رات کو وہ وہاں کشتی تک پہنچے تھے اور یہ کہ ان کے پاس پہاڑوں کی چڑھائی کے لئے موزوں لباس، ہتھیار اور اوزار موجود تھے۔

اس کشتی کے بارے میں تیسرا واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے جس کی تفصیلات یوں بیان کی جاتی ہیں کہ جارج جیفرسن گرین نامی ایک انجینئر جو تیل کی تلاش میں اس علاقے کا سروے کر رہا تھا ایک روز ہیلی کاپٹر میں اس علاقے پر معمولی پرواز میں مشغول تھا کہ اچانک ارارات پہاڑ کی چوٹی پر جمی برف میں اسے ایک سیاہ چیز دکھائی دی۔ شروع میں وہ اسے سلائیڈ سمجھا مگر تجسس نے اسے مجبور کیا اور وہ اپنا ہیلی کاپٹر ایک چوٹی کے قریب لے گیا تو اس کے بیان کے مطابق "وہ کوئی لکڑی کی بہت بڑی چیز تھی جس کا بیشتر حصہ برف میں دبا ہوا تھا یہ جگہ پہاڑ کے شمال مشرق میں واقع تھی" چنانچہ گرین نے اس کی بہت سی تصویریں اتاریں۔ ریڈیو پر اس نے پیغام دیا کہ اس نے ایسی چیز پائی ہے جو پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دے گی۔ گرین نے اس پرواز سے واپس آ کر اعلان کیا کہ وہ اس کشتی کے بارے میں مکمل تحقیق کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور یہ کہ وہ اس کے دعوے کو ثابت کر کے دم لے گا۔ وہ اس تحقیقی عمل میں مصروف ہی تھا کہ

میں ۱۹۷۲ء میں پراسرار حالات میں ان کا انتقال ہو گیا، اور اس کے سامان کی تلاش میں وہ چیزیں اور تصویریں دستیاب نہیں ہو سکیں۔ جن کے لئے اس نے کئی دفعہ ارارات کے علاقے پر پرواز کی تھی۔

اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں ایک فرانسیسی مہم جو (Fernand Navarra) فرنینڈ نوارا گھومتا پھرتا کوہ ارارات کی طرف جا نکلا وہ کشتی کے بارے میں کوئی خصوصی تحقیق کرنے نہیں آیا تھا لیکن اس کی معمولی سی مہم تھی ارارات کے خاموش آتش فشاں کے شمال مغرب میں ایک بڑے گلیشیر میں اسے ایک لکڑی کا ٹکڑا ملا، جس کا وہاں وجود محال تھا وہ اسے لیکر سپین چلا گیا۔ جہاں سپین کی وزارت جنگلات کی لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کیا گیا۔ جس کے مطابق اسے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے توڑا گیا تھا۔ اس میں سب سے بڑی حیرت کی بات یہ تھی کہ پانچ ہزار برس قبل اس علاقے میں اس بلندی پر کوئی آبادی نہیں تھی۔

اسی طرح ۱۹۷۰ء میں ایک امریکی ائیر فورس کا ملازم جو ترکی میں تعینات تھا، بغیر اجازت ارارات کی طرف مہم جوئی کیلئے روانہ ہوا اس کا نام ایڈورڈ بیلنگ تھا۔ اس سا تھ اس کے ترکش کے دو ساتھی بھی تھے۔ ان کا مقصد سیر و تفریح اور کچھ اچھا وقت گذارنا تھا۔ مگر اتفاقاً وہ لوگ کشتی کے قریب پہنچ گئے کوہ ارارات پر انھوں نے بمشکل تین چوتھائی راستہ طے کیا تھا کہ انہیں کشتی نیچے سے نظر آنے لگی۔ ایڈورڈ کے بقول "وہ چار سو دل پر موجود تھی، چٹان پر ٹکی ہوئی تھی۔ اور اس کا کئی فٹ حصہ برف سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق اگر وہاں برف پگھل جائے تو کشتی وادی میں آگرے گی اس کشتی کا جنوبی حصہ ٹوٹا ہوا تھا، اور اس میں جنوبی طرف سے داخلہ آسان نظر آتا تھا۔" کشتی کی ہیبت کے بارے میں کیا کہنا ہے: "اس کو دیکھتے ہی ہم پر ہیبت طاری ہو گئی یوں لگتا تھا جیسے ہم پر کوئی آفت آپڑے گی۔ ہم سب کا فیصلہ تھا کہ ہمیں اس کے قریب نہیں جانا چاہیئے چنانچہ ہم فوراً وہاں سے بھاگ گئے۔"

اس سلسلے میں آخری کوشش سکاٹ، وائن ڈائیک کرنا چاہتا ہے جو ایک امریکی باشندہ ہے۔ اس نے حال ہی میں ترکی کے متعلقہ حکام کو درخواست دی ہے کہ وہ کوہ ارارات کا مکمل جائزہ، تحقیق اور مطالعہ کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے بقول حضرت نوحؑ کی کشتی نہ صرف وہاں موجود ہے بلکہ اس علاقے سے اس آسمانی عذاب کے مزید شواہد بھی مل سکتے ہیں۔ جو آج سے ہزاروں سال قبل آیا تھا۔ ۱۹۸۱ء کے وسط میں ایک سال قبل دائر کی تھی۔ اس درخواست کو ترکی کی وزارت داخلہ نے کوئی وجہ بتائے بغیر مسترد کر دیا ہے۔ اس کی وجوہات سیاسی ہو سکتی ہیں۔ کہ ترکی روس کو یہ شبہ نہیں دینا چاہتا کہ اس کی سرحد پر کوئی جاسوسی کارروائی ہو رہی ہے اس کے علاوہ انکے اندرونی مصلحتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر سکاٹ، وائن ڈائیک بقول میں جولائی سے اگست تک ترکی کے حکام کو یہ یقین دلانے کی مسلسل کوشش کرتا رہا کہ ارارات پر حضرت نوحؑ کی کشتی موجود ہے اور اس کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسکے مطابق کشتی ۴۹۰۰ میٹر اور ۴۷۰۰ میٹر کی سطح پر ۱۵ میٹر کی بلندی پر پہاڑ کے شمالی رخ پر برف میں گڑی ہوئی ہے۔ اسکے علاوہ ترکی ہی میں سے ۱۹۸۰ء میں ایک راسخ العقیدہ مسلمانوں کے گروہ نے کوہ ارارات پر جانے کی اجازت طلب کی تھی جسے مذہبی وجوہ کی بنا پر مسترد کر دیا گیا تھا۔ اب سکاٹ ڈائیک کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے متعلقہ حکام نے یہ یقین بھی دلایا ہے کہ ایسے امکانات موجود ہیں کہ وہ ایک یا دو سال میں کسی ایسی مہم کی اجازت دے دیں، جو کہ کوہ ارارات پر جا کر سائنسی تحقیق و مشاہدہ کی روشنی میں اس کشتی کی حقیقت کے بارے میں شواہد مہیا کرے گا۔

کوہ ارارات پر کشتی کی موجودگی کا خیال جو بھی رہا ہو مگر اس میں کوئی شبہ نہیں مذہبی کہانیاں اور وہ حقیقت جو موجودہ وجہ مطابق

غزل

عزیز بگھروی

آنکھیں بوجھل، ذہن پریشاں، دل افسردہ لگتا ہے
چہرہ چہرہ اک مدت سے اترا اترا لگتا ہے

پھیکا پھیکا رنگ حقیقت، خواب سنہرا لگتا ہے
محفل محفل شیشہ پتھر، پتھر شیشہ لگتا ہے

غنچہ غنچہ شعلہ بداماں، ٹہنی ٹہنی رقص شرر
باغ تمنا حد نظر تک آگ کا صحرا لگتا ہے

کشتہ کشتہ فکر کی لو ہے، مدھم مدھم درد کی ضو
نغمہ نغمہ صوت و صدا کا ایک تماشا لگتا ہے

یاد تمہاری نشتر نشتر، ذکر تمہارا مرہم زخم
ایک کا چہرہ قاتل جیسا ایک مسیحا لگتا ہے

رفتہ رفتہ ہو گئے روشن اور نہ جانے کتنے چراغ
داغ تمنا دل میں ابھی تو تنہا تنہا لگتا ہے

محفل محفل چھوڑ چلے ہم روشن روشن نقش عزیز
آج ہمارا رنگ تغزل گہرا گہرا لگتا ہے

جامعہ کے لیل و نہار

۱۰ طلبہ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ۱۴ر اپریل کو جامعہ کے اندر طلبہ قدیم کی شوریٰ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں دو تین ارکان اپنی مجبوریوں کی بنا پر شریک نہ ہوسکے۔ کارروائی کا آغاز رضوان احمد فلاحی عرفی کے تذکیری کلمات سے ہوا۔ دو سالہ اجلاس کے موقعہ پر طے شدہ امور کی خواندگی کی گئی۔ مجموعی طور پر یہ تاثر سامنے آیا کہ افراد کی قلت کی وجہ سے خاطر خواہ کام نہ ہوسکا۔

دو سالہ اجلاس کے موقعہ پر یہ بات متفقہ طور پر طے پائی تھی کہ جس مقام پر دو سے زائد فلاحی موجود ہوں وہاں طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی ایک شاخ قائم کی جائے۔ افراد تعین خود اپنا صدر و سکریٹری منتخب کریں۔ اس طرح یہ صدر و سکریٹری کا فرض ہوگا کہ وہ مرکز سے ربط رکھیں۔ البتہ جہاں صرف دو ہی فلاحی موجود ہوں وہاں کا ذمہ دار مرکز کی طرف سے منتخب ہوگا۔ جہاں منفرد فلاحی ہوں ان کا یہ فرض ہوگا کہ مرکز سے برابر ربط رکھیں۔ ____ مگر افسوس اب تک اس پر عمل نہ ہوسکا۔ صرف بعض جگہوں سے اطلاعات ملی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

① علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جہاں فلاحی حضرات کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ان لوگوں نے جناب مسعود حسین فلاحی صاحب کو وہاں کی شاخ کا صدر اور آزاد اقبال فلاحی صاحب کو سکریٹری منتخب کیا ہے۔

② سعودی عرب جہاں فلاحی بھائیوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے۔ وہاں طائف، مکہ اور مدینہ کے علاوہ دوسرے مقامات مثلاً ریاض و الخرج کے ذمہ دار حافظ امین الہدیٰ فلاحی مقرر ہوئے ہیں۔

③ لندن جہاں ابھی صرف ایک فلاحی جناب ظفر انصاری صاحب موجود ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انشاء اللہ عنقریب وہاں تین فلاحی ہوجائیں گے تو اپنا ذمہ دار وہ لوگ منتخب کرلیں گے۔

دیگر مقامات سے کوئی اطلاع نہیں آئی جس پر ارکان شوریٰ نے افسوس ظاہر کیا۔ امید ہے کہ آئندہ بہت جلد لوگ اپنے اپنے مقامات کے بارے میں اطلاع دیں گے۔

ارکان شوریٰ نے جامعہ کے استاد جناب مولانا داؤد اکبر اصلاحی صاحب کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ مرحوم کے حق میں دعائیں کیں۔ اسی طرح جامعہ کے سابق استاد جناب ماسٹر اکرام الدین صاحب کے انتقال پر اپنے قلبی حزن و ملال کا اظہار کیا اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی۔ ____ اللہ تعالیٰ دونوں بزرگوں کی مغفرت فرمائے اور

انھیں اپنی وسیع و عریض جنت میں جگہ دے۔ آمین

اجلاس نے آئندہ زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا عزم کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انجمن کو جامعہ کے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید بنائے اور فارغین جامعہ کو اپنی ذمہ داریوں کو پہچاننے اور اسلام و جامعہ کی خدمت کا موقع عنایت فرمائے۔

جامعہ کی انتظامیہ کا اجلاس

۱۵/ اپریل ۸۲ء کو جامعہ میں انتظامیہ کا اجلاس ہوا، جس میں ملک کے مختلف گوشوں سے ارکان انتظامیہ تشریف لائے۔ صبح کو کارروائی کا آغاز ہوا۔ اور شب میں عشاء تک اجلاس کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مستقبل میں جامعہ ان کے ہاتھوں زیادہ سے زیادہ ترقی کے منازل طے کر سکے۔ آمین

اسلامی طلبہ تنظیم (ایس۔آئی۔او) کا قیام

یہ حقیقت ہے کہ جامعہ نے اپنے تحریکی مزاج کی بنا پر ہر اسلامی پکار پر لبیک کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایس۔آئی۔ایم کا قیام عمل میں آیا تو جامعہ کے طلبہ نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا اور اب جبکہ تحریک اسلامی کی طرف سے ایس۔آئی۔او کے قیام کا فیصلہ ہوا تو اس میں بھی جامعہ کے طلبہ نے بھرپور ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیا اور ۱۵/ اپریل ۸۲ء کو جامعہ میں ایس۔آئی۔او کی شاخ قائم ہو گئی جس کے چند روز میں ۶۰ ممبر بن چکے ہیں۔ ہمدردان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اس کے صدر حامد علی مظاہر صاحب ہیں۔

اسی طرح قصبہ بڑا گاؤں میں بھی ایس۔آئی۔او قائم ہو چکی ہے جس کے صدر امتیاز احمد اور سکریٹری صباح الدین ہیں۔ انھیں کی قیادت میں یونٹ سرگرم عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جامعہ کے تمام ہی طلبہ کو دین کا صحیح اور گہرا علم عطا ہو اور وہ دین کے عالم اور داعی بن کر نکلیں۔ آمین۔

امسال فارغ ہونے والے طلبہ

۹/ مئی کو امسال جامعہ سے فارغ ہونے والے طلبہ کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام اساتذہ اور دیگر ذمہ داران جامعہ شریک ہوئے۔ فارغ ہونے والے بھائیوں نے اپنے احساسات و جذبات کو تحریری شکل میں بھی پیش کیا اور تقریری شکل میں بھی۔ پھر اساتذہ و ذمہ داران جامعہ نے انھیں اپنے قیمتی مشوروں، دعاؤں سے نوازا۔ انھیں بیش بہا اور لازوال نصیحتیں بھی کیں جو آئندہ زندگی میں ان کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکیں۔ آخر میں طلبہ نے عہد کیا کہ ان شاء اللہ وہ مستقبل میں زندگی کے میدان عمل میں ایک مجاہد کا رول ادا کریں گے۔ اور وہ جہاں بھی ہوں گے اسلام اور جامعہ کی نیک نامی کا ذریعہ بنیں گے۔

جامعہ میں امیر جماعت اسلامی کی آمد

۷/ مئی ۸۲ء کو امیر جماعت اسلامی جناب مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی و سابق ناظم جامعہ تشریف لائے۔ اس موقع پر مولانا کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی دی گئی جس میں اساتذہ جامعہ، ارکان مجلس انتظامیہ اور قصبہ کے عمائدین ایک خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر ایک مختصر سا پروگرام بھی رکھا گیا۔ مولانا نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود جامعہ سے قلبی لگاؤ کی بنا پر اپنا قیمتی وقت دیا۔ مولانا کے چند افتتاحی کلمات کے بعد سوال و جواب کا پروگرام تقریباً ۲ گھنٹے تک چلا جس میں طلبہ نے مختلف قسم کے تحریکی اور معلوماتی سوالات کیے۔ مولانا نے بڑے دلنشین انداز میں جوابات دیے۔ موصوف کے ایک جملے سے جامعہ سے بے انتہا محبت اور وابستگی کا پتہ

(بقیہ صفحہ پر)